خیالات

غلام نبی خیالؔ

غلام نبی خیالؔ

خیالات

اُردو زبان میں تحقیقی، تنقیدی
اور تجزیاتی مقالات کا مجموعہ

ناشر

کشمیری رائٹرس ایسوسی ایشن

سرینگر، کشمیر

نام کتاب	:	خیالات
زبان	:	اُردو
مصنف	:	غلام نبی خیالؔ
کمپوزنگ	:	نسیم اختر (9469452003)
تزئین سرورق	:	بشیر احمد
طباعت	:	رنگ محل، نئی دلّی
اشاعت اوّل	:	2009ء
قیمت فی جلد	:	300روپے
	:	20امریکی ڈالر

Title of the book	:	***Khayalaat***
Language	:	Urdu
Author	:	**Ghulam Nabi Khayal**
Genre	:	Research Articles
Composing	:	Naseem - Akhter (9469452003)
Cover Design	:	
Printing	:	Rang Mahal, New Delhi
First Edition	:	2009 AD
Price per Copy	:	Rs.300 *or* 20$
Publishers	:	Kashmiri Writers Association
	:	15, Rawalpora, Housing Colony, Srinagar-190005 Kashmir, India. Mob: 09419005909

(اس کتاب کی اشاعت کے لئے جموں وکشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز سے جزوی مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکادمی کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس ضمن میں کلچرل اکادمی پر کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔)

انتساب

میں اپنی اس تصنیف کو

سرزمینِ کشمیر کی عظیم تاریخ،

شاندار ماضی اور مالامال

تہذیبی ورثے کی نذر کرتا ہوں۔

— خیال

مندرجات

حرفِ اوّل

گزشتہ پچپن سال کی میری ادبی زندگی کا سفر ہنوز جاری ہے اور نہیں معلوم کہ یہ افسانہ کب اپنے منطقی انجام کو پہنچے گا۔ میں تو ہر پل ہر لمحے اور ہر گھڑی اس حقیقتِ ابدی کا سامنا کرنے کے لئے دل وجان سے تیار رہتا ہوں۔

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نَے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اب تک میری 24 تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور یہ میرا پچیسواں تخلیقی مجموعہ ہے۔ ان مطبوعات میں کشمیری میں 16، اُردو میں 8 اور انگریزی میں ایک کتاب شامل ہے۔ ان میں سے میری کشمیری تصنیف گاشرِ مُنار (روشنی کے مینار) کو 1975ء میں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا ہے۔ اس طرح سے اوسطاً ہر دو سال کے بعد میری ایک کتاب منظر عام پر آتی رہی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں کشمیر اور دیگر موضوعات پر میرے تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مضامین شامل ہیں جو بالخصوص غیر کشمیری اور اُردو دان طبقہ ناظرین کے لئے بہت حد تک معلومات افزا اور مستفید ثابت ہوں گے۔

امید ہے کہ ''خیالات'' کو بھی میری دیگر تصانیف کی طرح قبولیت اور پذیرائی کا شرف حاصل ہوگا۔

غلام نبی خیالؔ
15۔ راولپورہ ہاؤسنگ کالونی، سرینگر۔190005، کشمیر

کتھا سرت ساگر

دنیا میں کہانیوں کا اوّلین مجموعہ

قدیم ہندوستان میں جو ادب پہلی بار زیرِ بحث لایا گیا وہ عوامی ادب تھا۔ یہ ادب ہندو حاکموں کے مختلف ادوار میں مندروں میں دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے ترنُم سے گائے جانے والے نغمات کی شکل میں وجود میں آیا جس طرح زمانۂ جاہلیت میں عربستان میں شاعری پہلے پہل اُس تحریک کے نتیجے میں شروع ہوئی جو عرب کے بدوی قبیلوں کو لق ودق صحراؤں میں سفر کرتے ہوئے اونٹوں کے گلے میں باندھی ہوئی گھنٹیوں کی مترنم آواز سے ملی جسے عربی شاعری میں حُدی کا نام دیا گیا۔

ہندوستان چونکہ ہندو ملک ہے اور یہاں ہندو دھرم کے دیوی دیوتا صدیوں سے پوجے جاتے ہیں لہٰذا اس ملک کی لوک شاعری بھی انہی کی شان میں قصیدہ خوانی یا بھجن یا پرارتھنا کی شکل میں موزون ہوتی رہی اور عام عقائد کے مطابق دیوی دیوتاؤں کی شان میں کسی بھی گستاخی کا کوئی امکان باقی نہیں رکھا گیا۔ شیو، برہما اور شنکر وغیرہ جیسے طاقت ور دیوتا انسان کے لئے ناقابل تسخیر قوتیں بن گئیں اور انہی کی شان میں لاکھوں اشعار تخلیق کئے گئے جو قدیم ہندوستان میں مذہب داروں اور مندروں کے پجاریوں کی کلاسیکی زبان بن گئی۔

ہندوستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں کہانیاں سنانے کا شوق ایک فن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہند میں ہی پارس کے باشندوں نے یہ فن سیکھ لیا اور اسے عربستان کی سرحدوں کے اندر تک پہنچایا۔ مشرق وسطیٰ سے داستان گوئی نے قسطنطنیہ اور وینس کی وادی تک کا سفر کیا اور پھر یہ انگلستان اور فرانس تک جا پہنچی۔ اگرچہ ان کہانیوں نے ہر ملک میں

وہاں کی مقامی زندگی اور حالات کی جزئیات کو اپنے اندر سمولیا لیکن ان میں جو ہندوستانیت کا امتزاج تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔

ہندوستان میں یہ بے شمار کہانیاں سالہا سال تک سینہ بہ سینہ کہی اور سنی گئیں اور بعد میں سب سے پہلے گناڈیہ نے انہیں ایک مقامی بولی پشاچی میں جمع کر لیا اور اپنے مجموعے کا نام برہت کتھا رکھا جواب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک کشمیری شاعر پنڈت سوم دیو نے اس گنج گم گشتہ کی باقی ماندہ امارت سے استفادہ کر کے گیارہویں صدی عیسوی میں کتھا سرت ساگر کے نام سے ایک ضخیم کتاب قلم بند کر لی جس میں اس نے لوک کہانیوں کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا۔

روایت یہ ہے کہ سوم دیو کی کتھا سرت ساگر دُنیا کی اوّلین لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ تھا جس میں اس کشمیری قلمکار نے لاکھوں اشعار پرمبنی ہزاروں کشمیری لوک کہانیوں کی شیرازہ بندی کی تھی۔ حاکمِ وقت نے سوم دیو کی جمع کردہ کہانیوں کے اسلوب پر تنقید کی جس سے دل برداشتہ ہو کر سوم دیو نے اپنی کہانیوں کے اس بہت بڑے ذخیرے کو نذرِ آتش کر دیا بعد میں اس حادثہ سے جو کچھ بچایا گیا اسے پھر دوسرے ہاتھوں نے از سرِ نو مرتب کر کے کتھا سرت ساگر کو مکمل طور پر ضائع ہونے سے بچایا اور بعد میں اسی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی۔

موجودہ کتھا اٹھارہ جلدوں اور ایک سو چوبیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں نثری حصے کے علاوہ بائیس ہزار اشعار درج ہیں۔ ان میں تین سو پچاس سے زیادہ کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کا حجم ہومر کی الیاڈ اور اوڈیسی دونوں کو ملا کر بھی ان سے دوگنا بن جاتا ہے۔ ایک تاریخ دان کے مطابق اس کا سالِ تحریر 1050 عیسوی بتایا گیا ہے۔ یہ عرصہ کھیمیندر کے بعد کا تیس سال کا عرصہ بتایا جاتا ہے۔

سنسکرت کے قدیم شاہ کاروں میں والمیکی کی رامائن، ویاس کی مہابھارت، وشنو شرما کی پنچ تنتر، اسوگھوس کی بدھ چرت، کالی داس کے ڈرامے شکنتلا، میگھ دوت، رگھوونش، کمار سمبھو وغیرہ، وشاکادت کا مشہور ڈرامہ مدرا راکھشس، بانہ بھٹ کا ہرش چرت، سوم دیو کی

کتھا سرت ساگر، جے دیو کی گیت گووند اور کلھن کی راج ترنگنی وغیرہ شامل ہیں۔
یہ عظیم کتابیں چوتھی صدی قبل مسیح سے بارہویں صدی عیسوی تک یعنی سولہ سو سال کے عرصۂ دراز کے دوران لکھی گئیں۔

سوم دیو کشمیر کے راجہ اننت کا درباری شاعر تھا۔ اُس کی کتھا سرت ساگر کو دُنیا میں کہانیوں کی سب سے ضخیم کتاب مانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں جو ابواب ہیں انہیں لمبکھ بھی کہا جاتا ہے جنہیں پھر ترنگوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتھا سرت ساگر میں مہم جوئی، شہزادوں کی زندگی، شہروں، سیاسی سازشوں، لڑائیوں، جادو اور دغا بازیوں اور چالبازیوں، حیوانوں، پرندوں، سادھوؤں، جواریوں اور طوائفوں کی داستانوں کی شیرازہ بندی کی گئی ہے۔ الغرض یہ کہانیاں زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی کرتی ہیں۔

کتھا سرت ساگر کی بنیاد اگر چہ فرضی طور پر برہت کتھا ہی پر رکھی گئی ہے لیکن برہت کتھا یا تو ایک فرضی تخلیق ہے یا وہ زمانے کے ہاتھوں ضائع ہو چکی ہے۔ سوم دیو کی کتاب لوک ادب کے نہایت قریب ہے لیکن اس نے اپنی فنی صلاحیتوں اور زبان و بیان پر خاصا عبور رکھنے کی بدولت اسے ایک نادر و یکتا تخلیق کا درجہ دیا ہے۔ اس دور میں اسقدر لطیف پیرائے میں بیان کی گئی کہانیوں کی اور کوئی کتاب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

کتھا سرت ساگر بیانیہ شاعری پر مبنی ہے جسے آسان مگر شستہ نظم میں قلم بند کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس میں کئی کہانیاں ہیں لیکن سوم دیو نے مرکزی داستان کی جزئیات کو اوّل تا آخر برقرار رکھا ہے۔ ان کہانیوں میں مزاح کے دوش بدوش غم کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ شار کا منشی کی زبان میں ''ان کہانیوں میں شاندار معیار اور دلنشین اندازِ بیان موجود ہے''۔[1] لوک ادب تحریر کرنے والوں نے دنیا بھر میں ان کہانیوں سے استفادہ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

اس قسم کی تخلیقات میں کم و بیش ایک ہی طرح کے دیو مالائی اور انسانی موضوعات پر داستانیں قلم بند کی جاتی تھیں۔ جس طرح پورانوں میں شامل کہانیوں کا تعلق جادو، موسیقی، سماجی رشتوں، مذہبی سرگرمیوں، شجاعت اور جنگ و جدل اور دیوتاؤں اور انسانوں کے

تیئں محبت کے اظہار کے ساتھ ہے۔ اُسی طرح سوم دیو کی کتاب کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کہانیاں دراصل بھگوان شیو نے پاروتی کو سنائی تھیں۔ پھر یہ کہانیاں پشپادت نے کان لگا کر سن لیں جس نے بعد میں گناڈیہ کے نام سے جنم لیا۔ اُسے شہنشاہ سالی واہر کے دربار میں ایک معزز درباری مقرر کیا گیا اور یہیں پر گناڈیہ نے یہ کہانیاں بارِ دگر پشاچی بولی میں ورطۂ تحریر میں لائیں۔ واسو بھاگ نے ان میں سے کئی کہانیاں اخذ کر کے انہیں پنچ تنتر نامی کہانیوں کے ایک اور مجموعہ میں شامل کر لیا۔ واسو بھاگ کی کہانیوں کا تذکرہ جاپانی، لاؤس اور سیامی کہانیوں کے مجموعوں میں بھی ملتا ہے۔

یہ پنچ تنتر کی کہانیاں جنہیں بعد میں وشنوشرما نے اپنی زبان و بیان میں مرتب کر لیا بجائے خود ایک کہانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا جس کا نام امرشکتی تھا۔ اس کے تین مجہول بیٹے تھے۔ امرشکتی نے عالم بے بسی میں اپنے درباریوں سے کہا کہ مجھے ان احمقوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی راستہ دکھاؤ۔ ان میں ایک نہایت عقل مند درباری تھا جس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شہزادوں کو مذہبی کتب کی تعلیم نہیں دی جانی چاہئے بلکہ انہیں فہم و فراست کے علم کی روشنی سے منور کیا جانا چاہئے۔ اس درباری نے بادشاہ سے کہا کہ اس کام کو وشنوشرما نام کا ایک دانشور ہی انجام دے سکتا ہے۔ وشنوشرما کو طلب کیا گیا اور پھر اُس نے چھ ماہ کے اندر پنچ تنتر مرتب کر کے نافہم شہزادوں کو اسے غور سے پڑھنے اور اس میں درج کہانیوں کے مثبت پہلوؤں کو ذہن نشین کرنے کی ہدایت کی۔ امرشکتی کو یقین نہیں آتا تھا کہ محض ایک کتاب تین جاہل نوجوانوں کی اس طرح ذہنی رہنمائی کر کے انہیں عقل و دانش سے مالا مال کر سکتی ہے۔

پنچ تنتر کی کہانیاں چرند و پرند کے اردگرد گھومتی ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ مشہورِ عام کہانی بھی شامل ہے جس میں ایک بار مگرمچھ نے ایک بندر سے دوستی گانٹھ لی اور وہ اسے ایک لذیذ میوہ کھلاتا رہا۔ ایک دن مگرمچھ نے یہی میوہ اپنی بیوی کو کھلایا تو اسے اس کی لذت اس قدر بھا گئی کہ جب اسے پتہ چلا کہ بندر روز یہی میوہ کھاتا ہے تو اسے خیال آیا کہ پھر بندر کا

کلیجہ یہ میوہ چکھ چکھ کے بے حد لذیذ بن چکا ہوگا۔ اُس نے مگرمچھ سے فرمائش کی کہ وہ اسے بندر کا کلیجہ نکال کے کھلا دے ورنہ وہ خودکشی کرے گی۔ مگرمچھ نے چارو ناچار اس فرمائش کو پورا کرنے کی غرض سے ایک روز بندر سے کہا کہ وہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو جائے تاکہ مگرمچھ اسے گہرے تالاب کی سیر کرا سکے۔ جب یہ دونوں تالاب کے بیچوں بیچ پہنچے تو مگرمچھ نے اسے اپنی بیوی کی خواہش کے بارے میں بتا کر کہا کہ میں تمہیں اسی جگہ میں ڈبو کر تمہارا کلیجہ نکال کر اسے کھلا دوں گا۔ ہوشیار بندر نے اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھی تو اس نے مگرمچھ سے کہا ''بھائی تم تو میرے جگری دوست ہو۔ میرا کلیجہ کیا میری جان بھی تمہاری بیوی کے لئے حاضر ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ میں اپنا کلیجہ اُسی درخت پر چھوڑ آیا ہوں جس پر میں رہتا ہوں۔ اگر تم نے پہلے بتایا ہوتا تو میں اُسے ساتھ لے کر آ جاتا''۔ مگرمچھ نے اس پر بھروسہ کیا اور اسے واپس کنارے کی طرف لے جانے لگا۔ بندر نے فوراً کنارے پر چھلانگ لگائی اور درخت پر چڑھ کر اپنی جان بچائی۔ اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک خونخوار اور ان جانے شخص پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

کتھا سرت ساگر میں شہزادہ نرواہن دت چھبیس بیویوں کو جیت کر جادوگروں کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں ایک کہانی کے اندر ایک اور کہانی کا خاکہ شامل ہے جس کی وجہ سے اس میں الف لیلیٰ جیسی دلچسپی اور انہماک کا عالم موجود ہے۔

کتھا سرت ساگر کی اوّلین کہانیوں میں وہ داستان بے حد دلچسپ ہے جس میں وارارو چی نام کا ایک شخص گھر سے باہر جاتا ہے تو کئی معزز ہستیاں اس کی خوبصورت بیوی اُپاکوشا پر ڈورے ڈالتی ہیں۔ اُپاکوشا ان سبھی عاشقوں کو یہ پیغام بھیجتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک خاص وقفے کے بعد اُس کے شبستان میں آئے اور اپنی جنسی خواہش پوری کر لے۔

اس طرح اپاکوشا چالاکی سے ہر ایک نام نہاد عاشق کو مادرزاد ننگا کر کے چراغ کے دھوئیں کی کالک اُس کے منہ پر ملتی ہے اور انہیں اسی حالت میں الگ الگ الماریوں میں بند کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہیرانے گپتا نام کا ایک سوداگر بھی وہاں آ کے اُس رقم کی واپسی

سے بہ آواز بلند انکار کرتا ہے جو اُس نے وارا روچی سے اُدھار لی تھی۔ وارا روچی کی واپسی پر اپا کوشا الماریوں کو کھول کر ان بد کردار مردوں سے یہ گواہی بھی دلواتی ہے کہ ہیرا نے گپتا نے بہ بانگ دہل قرض لوٹانے سے انکار کیا۔ وارا روچی خود صاحبِ اختیار تھا لہٰذا اُس کے حکم سے ان سبھی مردوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں اور انہیں سزائیں بھی دی گئیں۔ کہانی نگار کے بقول اس کہانی کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی بھی شخص غلط کاری سے خوش حال نہیں ہو سکتا۔

سوم دیو شیو کا پجاری ایک برہمن تھا۔ اس کا اصلی نام سوم تھا اور دیو اس نے برہمن ہونے کے حوالے سے اپنے نام کے ساتھ جوڑا تھا۔ این ایم پینزر کے خیال میں کتھا سرت ساگر 1070ء کے آس پاس یا اُس کے اڑھائی سو سال بعد تخلیق کی گئی ہوگی۔

النکار شاستر سے قطع نظر جس میں کشمیر نے نام کمایا تھا۔ اُس زمانے کے کشمیر میں سوم دیو، کھیمیندر، دامودر گپت، بلہن اور کلہن آسمان ادب کے روشن ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان عظیم تخلیق کاروں نے اپنے فن کے میدان میں بہت بڑے معرکے سر کیے اور عظیم المرتب قلم کاروں کی صفوں میں اپنی جگہ بنائی۔

ڈاکٹر کے ایم پانیکر کا یہ کہنا درست ہے کہ ''کشمیر میں دورِ قدیم سے لے کر چھٹی صدی عیسوی تک سنسکرت میں جو بھی ادب تخلیق کیا گیا وہ ناپید ہے''۔

اگرچہ آٹھویں صدی اور اُس کے بعد کی تخلیقات پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دور کشمیر میں تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور ایک سنہرا دور رہا ہوگا۔ راج ترنگنی میں بھی کلہن نے کئی ایسے پیش رو شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس سے پہلے سنسکرت کی کلاسیکی زبان میں ادب کی گوناگوں اصناف میں اپنی فن کاری اور تخلیقی مہارت کے گل و گلزار کھلائے۔ پانیکر کے بقول اس دور میں کشمیر کے ایک حکمران واسونند نے فحش نگاری پر سمر شاستر کی ایک مشہور کتاب تصنیف کی۔ اگرچہ یہ تصنیف بھی زمانے کی ستم رانیوں کا شکار ہو کر ضائع ہو چکی ہے۔[2]

کتھا سرت ساگر کا پہلا انگریزی ترجمہ سی ایچ ٹانے نے کیا جو 1880ء میں شائع

ہوا۔اس ترجمہ کے بارے میں جیمز میلنسن کا کہنا ہے کہ ''یہ اس قدر واضح اور برمحل ہے کہ اسے پڑھ کر ہر کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ اس کتاب کو پھر سے زیر ترجمہ لانے کی کیا ضرورت ہے''۔[3] جیمز میلنسن نے خود بھی کتھا سرت ساگر کا ترجمہ کیا ہے۔ بعد میں اس عدیم المثال تخلیق نے این ایم پینزر کو بے حد متاثر کیا اور اس نے بھی 1927ء میں دس ضخیم جلدوں میں *Ocean of Stories* کے نام سے اس کا ترجمہ کیا۔



حوالہ جات

(1)- آن دی امپارٹنس آف کشمیری کلچرل ہیری ٹیج، وتستا ویب سائٹ۔

(2)- وتستا سالنامہ، کشمیر سبھا کلکتہ، جلد 32، 99-1998ء

(3)- کلے سنسکرت لائبریری، کتھا سرتِ ساگر، یونیورسٹی پریس اینڈ دی جے سی فاؤنڈیشن، نیویارک، 06-2005ء



راج ترنگنی

تاریخ کشمیر کا پہلا سنگِ میل

کلہن پنڈت کشمیر کا ایک ممتاز مؤرخ اور شاعر ہے۔ اُس کا باپ چنپک راجہ ہرش (1089-1102ء) کے دور میں دوار پتی یا سرحدی گذرگاہوں کا کماندار تھا۔ کلہن کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ بادشاہانِ کشمیر کے حالات وواقعات قلم بند کرے۔ جب سُسالا (1127ء) کی وفات کے بعد جے سمہا نے حکومت سنبھالی تو کلہن کو درباری شاعر بنایا گیا اور اس طرح اسے راج ترنگنی لکھنے کا موافق ماحول میسر ہو سکا جو اس نے 1148 عیسوی سے لے کر تقریباً دو سال کے عرصے میں مکمل کر لی۔

ایک روایت کے مطابق کلہن نے اس کے علاوہ جے سمہا بھو دایا (Jaya Simhabhyudaya) عنوان کی ایک طویل نظم بھی لکھی جس میں اس نے اپنے مربی اور سرپرست بادشاہ جے سمہا کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کتاب کا مسودہ اگرچہ محفوظ نہیں رہ سکا ہے لیکن اس کے چند ابیات رتنا کتھا سرسمیو کایا (Ratna Katha Sarasamuccaya) میں نقل کئے گئے ہیں۔

اگرچہ کلہن اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں بیان کرتا ہے لیکن حقائق اور تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک پڑھا لکھا برہمن تھا۔ اس کی علمی صلاحیتوں کا اظہار راج ترنگنی میں اسی اعلیٰ پایہ کے انداز میں ہوتا ہے جو عالم وفاضل کشمیری پنڈت برہمنوں کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ برہمنوں کے تئیں اس نے اپنی تاریخ میں ہمدردی اور یکجہتی کا جو بھرپور مظاہرہ

کیا ہے اس سے بھی اس کے ایک صالح برہمن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس ضمن میں جونراج نے بھی تمام شکوک وشبہات کوختم کردیا ہے جب وہ اپنی دوتیاراج ترنگنی میں کلہن کو ''دِوجا'' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ کلہن شیو کا پرستار تھا اور اس لئے اس نے راج ترنگنی کے ہر حصے کی ابتداء میں بھگوان شیو اور اس کی رفیقہ گوری کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

راج ترنگنی کے بارے میں خوش قسمتی سے کلہن نے خود اور واضح طور پر کہا ہے کہ اس نے یہ کتاب لوککا (Laukika) کے عہد کے 4224 ویں سال یعنی 49-1148ء میں لکھنی شروع کی اور اگلے سال اس کام کو مکمل کرلیا۔

کلہن نے بنیادی طور پر راج ترنگنی شاردا رسم الخط میں لکھی اور اسے ساتھ ہی دیوناگری خط میں منتقل کیا گیا لیکن اس وقت کے خطاط یا لپی کاران دونوں رسوم خط سے پوری طرح واقف نہیں تھے لہٰذا راج ترنگنی کے اوّلین مسودات میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

راج ترنگنی کے کا شاردا میں تحریر کردہ قدیم ترین مسودہ غالباً کشمیر سرکار کے تحقیقی کتب خانے میں موجود ہے۔ دوسرا مسودہ جسے پنڈت گنہ کاک نے تیار کیا تھا اور جس پر پنڈت صاحب رام نے حواشی تحریر کئے تھے، خدا جانے موجود ہے بھی یا نہیں۔

راج ترنگنی کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کلہن نے کشمیر کی وادی میں تقریباً ہر جگہ بغور دیکھی ہے۔ اس لئے وہ نہایت اطمینان اور یقین کے ساتھ یہاں کے مقامات، قصبوں اور دیہاتوں کے نام لیتا ہے اور مقامی حالات وواقعات کے بارے میں اپنے شاعرانہ بیان کو تکرار کے ساتھ دہراتا ہے۔ وہ سرزمین کشمیر کی مدح سرائی یوں کرتا ہے۔ ''یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں کے لوگ زیادہ تر دوسری دنیا یعنی آخرت کا خوف کھاتے ہیں۔ جہاں زمستان کے دِنوں میں گرم حمام موجود ہوتے ہیں۔ جہاں دریاؤں کے کناروں پر بیٹھنے کی آرام دہ جگہیں ہیں۔ جہاں ندی نالوں میں نجس حیوانات دکھائی نہیں دیتے اور وہ کسی بھی قسم کے خطرات سے پاک ہیں۔ جہاں اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہاں کے باشندے گرمی کی شدت برداشت نہیں کرسکتے، سورج کی تمازت والی کرنیں گرمی کے

دنوں میں بھی اپنے اندر ایک حلاوت اور ٹھنڈک رکھتی ہے۔ اونچے اونچے رہائشی مکان، زعفران، یخ جیسا ٹھنڈا پانی، انگور اور اسی طرح کی نعمتیں جو جنت الفردوس میں بھی مہیا نہیں ہوسکتیں"۔

راج ترنگنی آٹھ ابواب یا ترنگوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ گونند خاندان کے راجاؤں، مقامی حکمرانوں، اشوک اور اس کے جانشینوں کا حال بیان کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں اُن کشمیری حکمرانوں کے حالات درج ہیں جن کا گونند خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تیسرے باب میں گونند خاندان کی بحالی کا ذکر اور کئی اور حاکموں کا حال مندرج ہے جن میں پرورسین کو تاریخی طور پر موجود شخصیت کی حیثیت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ چوتھی ترنگ میں کرکوٹا خاندان کی تاج پوشی کا ذکر ہے۔ کرکوٹا خاندان کے راجگان کو اُتپالا حاکموں نے تخت سے سبکدوش کر دیا جس کے کوائف راج ترنگنی کے پانچویں حصے میں درج ہیں۔ کتاب کے چھٹے باب میں ویرادیو اور ابھینو کے وارثوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ساتویں کتاب کا آغاز لوہار اسلطنت کے راجا سام گرام راجا (Samgram raja) کی تاج پوشی اور اس کا اختتام ہرش کی وفات سے ہوتا ہے۔ آٹھویں ترنگ، جو ساری کتاب کے تقریباً نصف حصے کے برابر ہے، لوہارو خاندان کی بحال شدہ حکمرانی اور اُکالا (Uccala)، سُسالا اور سُسالا کے بیٹے جے سمہا کے احوال پر مبنی ہے۔ یہ وہی ہرش ہے جس نے کلہن کے زمانے میں کشمیر پر حکومت کی۔

کلہن نے راج ترنگنی لکھنے کی غرض سے قلم اٹھاتے وقت ہی اپنے ہم عصر اور ماسبق شاعروں اور وقائع نگاروں کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب کے بارے میں اعتذار کے لہجے میں کہا "میری غرض وغایت کو ذہین نشین کئے بغیر میری اس تصنیف کو محض اس لئے بالائے طاق نہ رکھیے کہ اس موضوع پر میرے پیشرو بھی خامہ فرمائی کر چکے ہیں"۔

یہ اظہار کلہن کی متانت اور حق گوئی کی دلالت کرتا ہے۔ پی این پشپ نے اس اعتذار کے پس منظر پر یوں روشنی ڈالی ہے کہ "اس میں شک نہیں کہ کلہن سے پیشتر چند

ایک کشمیریوں نے تاریخ لکھنے کی سعی بھی کی تھی لیکن ان کی تصانیف کا کینواس محدود اور پیش کش سطحی تھی۔ ویسے بھی کلہن نے اپنے جن پانچ پیش روتواریخ نویسوں یعنی سرورت، کھیمیندر، ہیلا راج، پدم مہر اور چھولاکر کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے کسی کی کوئی تصنیف ہم تک نہیں پہنچی ہے۔

کلہن کی دیانت داری دیکھئے کہ کھلے بندوں اپنے پیش رووں کے تئیں احساس مندی کا اعتراف کرتا ہے۔(1)

کشمیر میں اگر چہ سنسکرت زبان میں تذکرہ نویسوں اور وقائع نگاروں کی کوئی کمی نظر نہیں آتی مگر ان کی نگارشات کو جدید میزانیہ کی رو سے تاریخ نویسی کی کسوٹی پر پرکھنا غالباً مناسب نہیں ہوگا کیونکہ یہ سبھی قلم کار اپنے اپنے عہد کے تاریخ نویس نہیں بلکہ یادداشتیں قلم بند کرنے والے لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ تاریخ نویسی کا کوئی واضح اور ٹھوس تصور موجود نہیں تھا۔ ایسی تخلیقات میں مبالغہ آمیزی اور رنگ سازی کے عناصر ضرور شامل ہوں گے۔ یونان کے کئی یادداشت نگاروں کا بھی یہی حال ہے اور کلہن کی راج ترنگنی کو بھی تاریخ نویسی کی مقررہ ضوابط کی رو سے تاریخ قرار نہیں دیا جاسکتا حالانکہ کلہن نے خود اپنی اس کاویہ یعنی طویل نظم کو ''بادشاہوں کا دربار'' کا نام دیا ہے لیکن جہاں تک کشمیر کے سنسکرت نگاروں کا تعلق ہے کلہن ان سبھی میں بہر حال افضل ترین مقام کا مالک ہے اور تذکرہ نویسی میں اس کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

کلہن کی زندگی کے بارے میں وضاحت کے ساتھ تفصیلات کا ذکر اُس نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے البتہ اس ضمن میں چند حوالے جون راج کے یہاں موجود ہیں جو کلہن کے تین سو سال بعد منظر عام پر آیا۔ لیکن اس خودستائی کے عمل سے دور رہنے کے باوجود کلہن کا نام زندہ رہا اور اس کی ادبی حیثیت میں بھی کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔

کلہن کی تاریخ نویسی کے سلسلے کو جون راج نے تسلسل بخشا جس کے بیان کردہ حالات اگر چہ واضح اور مثبت ہیں لیکن اس کے یہاں کلہن جیسے عظیم فن کار کا عظیم تخیل نظر

نہیں آتا۔

کلہنؔ کا زمانۂ کشمیر کا ایک دورِ ابتلا تھا جس میں غیر یقینی صورتحال، بے راہ روی، بدکرداری اور تذبذب کا غیر انسانی ماحول ہر شئے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے الفاظ میں ''یہ سازشوں اور قتل و غارت کا زمانہ تھا جس میں بھائیوں اور قرابت داروں کے ساتھ مخاصمت اور دُشمنی کا بازار گرم تھا۔ وزراء اور امراء اقتدار کی رسہ کشی میں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھے۔ بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ ایک راجہ جو اُچالاؔ کا جانشین راڈھا عرف سانکاؔ کہلایا جاتا تھا صرف ایک رات کو چند گھنٹوں تک ہی اپنا تخت سنبھال سکا۔ اُس کے چچیرے بھائی سالہناؔ کو صرف آٹھ ماہ تک راج کرنا نصیب ہوسکا۔ بادشاہ ایک یا دوسرے کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں بن کے رہ گئے تھے۔ ملک میں کوئی قانون یا قانون کی پاسداری نہیں تھی۔ حکمران بے تحاشا شراب پیتے تھے اور ان کے وزیر اور مشیر جاہل اور ظالم تھے جنہیں اپنی مادرِ وطن سے ذرّہ بھر بھی لگاؤ نہیں تھا۔ مسخرے اہم عہدوں پر فائز کئے گئے تھے اور انہوں نے وزارت کی کرسیوں پر بھی قبضہ جمایا تھا۔ بزدل اور احمق نوجوان کماندار بنائے گئے تھے''۔

بارہویں صدی کے اوائل میں اہل کشمیر نے اس امید پر وو پادیوؔ کو اپنا راجہ چن لیا کہ وہ اس بے ہنگم صورتحال میں کوئی بہتری لائے گا لیکن اس نے بھی اپنی احمقانہ حرکتوں سے اپنے حامیوں کی توہین کر کے انہیں مایوس کر دیا۔ اسے پتھروں کے بھاری بھرکم چٹان دیکھ کر ایک عجیب سی ذہنی تسکین ہوتی تھی اور اس نے اپنے وزراء کو حکم دیا کہ وہ حیوانوں کا دودھ پلا کر چھوٹے چھوٹے پتھروں کو بڑی چٹانوں میں تبدیل کر دیں۔ (2)

ان تواریخی حالات سے ظاہر ہے کہ کلہنؔ جیسا حساس مورخ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور اس نے راج ترنگنی میں یہ حالات پیدا کرنے والوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ہے لیکن اس شہر آشوب میں اس نے ایسے واقعات بھی درج کئے ہیں جو واقعاتی طور پر اور اعداد و شمار کی روشنی میں صحیح معلوم نہیں ہوتے بلکہ یہ آج ہمیں ناقابل اعتبار نظر آتے

ہیں۔ ہم یہاں پر ایسے دو واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔

کلہن کہتا ہے کہ ”شاندار بادشاہ اشوک نے سرینگر شہر کی بنیاد ڈالی جس میں مال ودولت سے بھرپور چھیانوے (96) لاکھ گھر تعمیر کیے گئے“۔

کیا یہ بیان بحث طلب نہیں ہے کہ ہزار سال قبل سرینگر شہر میں چھیانوے لاکھ مکانات تعمیر کیے گئے جن میں ظاہر ہے کروڑوں لوگ رہتے ہوں گے جبکہ موجودہ شہر سرینگر کی کل آبادی پندرہ لاکھ کے قریب ہی بتائی جاتی ہے۔

اسی طرح کلہن نے مہر گل راجا کے وقت کا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب اُس نے چندر کوہل کی صفائی کا کام شروع کرنا چاہا تو اس کے بیچوں بیچ موجود ایک چٹان نے اس میں رکاوٹ ڈالی۔ راجا نے اِس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے تپسیا کی اور دیوتاؤں نے خواب میں آکر اس سے کہا کہ اس چٹان کے اندر ایک پاکباز ذی جان رہتا ہے اور اسے صرف ایک باکردار اور باعصمت عورت ہی ہٹا سکتی ہے۔ راجہ یہ سن کر فوراً حرکت میں آگیا اور اس نے پہلے اونچے خاندانوں کی خواتین کو پتھر ہٹانے کا حکم دیا لیکن اسے یہ دیکھ کر نہایت دکھ ہوا کہ اس میں سے کوئی یہ کام سرانجام نہیں دے سکی جس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے ملک میں کوئی عورت اپنی عصمت لٹائے بغیر نہیں جی رہی تھی۔ بعد میں ایک کمہارن چندراوتی کے ہاتھوں یہ چٹان فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ ایک ناراض اور دل برداشتہ راجا نے تین کروڑ عورتوں کو مع ان کے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کے تہہ تیغ کروا ڈالا۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس وقت کشمیر کی آبادی کا ایک حصہ تین کروڑ خواتین اور اُن کے کروڑوں رشتہ داروں پر مشتمل تھا، یقین نہیں آتا۔

راج ترنگنی کے جو تراجم وقتاً فوقتاً دوسری زبانوں میں کیے گئے ان کی تفصیل سوم ناتھ در نے آرسی پنڈت کے ترجمہ سے نقل کر کے یوں درج کی ہے۔

”راج ترنگنی کے ایک حصے کا پہلا ترجمہ سلطان زین العابدین (1420-1470ء) کے حکم سے فارسی میں کیا گیا اور اس کا نام ”بحر الاسمار“

یا ''کہانیوں کا سمندر'' رکھا گیا[3]۔ شہنشاہ اکبر نے جب کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تو 1594ء میں عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ وہ اس ترجمہ کو مکمل کرلے۔ ابوالفضل نے اپنی تصنیف ''آئینِ اکبری'' میں کشمیر کی اس قدیم تاریخ کا خلاصہ شامل کرلیا اور اس کے لئے کلہن کو ماخذ قرار دیا۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں ملک حیدر نے 1617ء میں راج ترنگنی کا مختصر ایڈیشن فارسی میں پیش کیا۔ فرانسس برنیر (1665) نے اپنی کتاب ''بہشتِ ہند'' میں راج ترنگنی کے اس ترجمہ کا حوالہ دیا جو حیدر ملک نے کیا تھا۔ اسی طرح ایک صدی بعد پادری ٹائی فن تھالر نے اس کا مختصر خلاصہ کیا۔

راج ترنگنی کا بہتر متنی مواد مورکرافٹ کو حاصل ہوا تھا۔ مورکرافٹ 1823ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اجازت سے سرینگر آیا اور اس نے قدیم شاردا نسخے سے دیوناگری مسودہ تیار کرلیا۔ یہی مسودہ راج ترنگنی کے اس ایڈیشن کی بنیاد بن گیا جو 1835ء میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام کلکتہ سے شائع ہوا۔

اس دوران ڈاکٹر ہوریس ہے مین ولسن نے کشمیر کی ہندو تاریخ پر اپنے اس انشائیے کی اشاعت سے شہرت حاصل کی تھی جس میں راج ترنگنی کے پہلے چھ ابواب کی تنقیدی تلخیص شامل کی گئی تھی۔ اس نے پہلی بار یورپی مورخین کو کلہن کی اس اہم تصنیف سے متعارف کیا۔

اصل سنسکرت متن پر مبنی راج ترنگنی کا پہلا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی کے اہتمام سے 1852ء میں فرانسیسی زبان میں شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ کار اے ٹرویر نام کا ایک فرانسیسی ادیب تھا جو کلکتہ سنسکرت کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا۔ جوگیس چندردت کا ترجمہ ''راجگانِ کشمیر''، کلہن پنڈت کی سنسکرت تصنیف راج ترنگنی کا ترجمہ کلکتہ میں 1879ء اور 1887ء کے درمیانی عرصہ میں شائع ہوا۔[4]

اُنیسویں صدی کے اخیر پر پنڈت دُرگا پرشاد نے بھی راج ترنگنی کا اپنا ایڈیشن سامنے لایا جسے بمبئی کے نرنائے پریس نے طبع کیا تھا۔ اس کے بعد آریل سٹاین نے 1900ء میں اس کتاب کا انگریزی نثر میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح اُردو میں مکمل ترجمہ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ نے دو جلدوں میں کیا جسے چنار پبلشنگ ہاؤس نامی ایک غیر معروف اشاعتی ادارے نے غیر قانونی طور پر سرینگر سے شائع کیا۔ اس پر تاریخ اشاعت درج کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

جواہر لال نہرو نے راج ترنگنی کے رنجیت سیتا رام پنڈت کے انگریزی ترجمہ کے پیش لفظ میں اس کشمیری مورخ کے فن، اظہار فن اور واقعات و حالات کی تصویر کشی کے بارے میں اس طویل اقتباس میں کہا ہے کہ ''یہ تاریخ بھی ہے اور ایک نظم بھی۔ حالانکہ شاعری اور تاریخ کا سنگم معیوب ہے خصوصاً ترجمہ میں اس طرح کے امتزاج سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں کیونکہ ہم شاعری کی لے اور موسیقی کا استحسان نہیں کر سکتے اور وہ بھی کلہن کی اس زبان کا جو اعلیٰ، عمدہ اور مترنم ہے۔ یہ قرونِ وسطیٰ کی داستان ہے اور اکثر و بیشتر یہ خوشگوار داستان نہیں ہے کیونکہ یہاں درباری سازشوں، قتل و غارت، بغاوت، خانہ جنگی اور ظلم و استبداد کی بہتات ہے۔ یہ آمریت اور فوجی ظلم و جبر کی داستان ہے۔ یہ عوام کی نہیں بلکہ راجاؤں اور شاہی خاندانوں اور اشراف کی داستان ہے پھر بھی کلہن کی یہ تصنیف راجاؤں کی مصروفیات کے بیانِ محض سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ سیاسی، سماجی اور کسی حد تک معاشی معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ یہاں ہم قرونِ وسطیٰ کا زرّہ بکتر دیکھتے ہیں۔ چمکتے اسلحہ سے لیس جاگیر دار بہادروں کو دیکھتے ہیں، سازشوں اور جنگوں کو دیکھتے ہیں، خواتین پردے کے پیچھے ہی نہیں بلکہ کونسلوں اور میدانوں میں لیڈروں اور سپاہیوں کی حیثیت سے بھی بہت اہم کردار ادا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بعض موقعوں پر ہم انسانی رشتوں اور محبت و نفرت، عقیدت اور ہمدردی سے انسانی محسوسات کے قریبی منظر دیکھتے ہیں۔ ہم سیّا کی تکنیکی کارگزاریوں اور آبپاشی کے طریقۂ کار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دُور دراز ملکوں میں للتا

دتیہ کی جنگی فتوحات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میگواہن کی اُن قابل ستائش کوششوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس نے عدم تشدد کو پھیلانے کے لئے کیں اور جس کے لئے وہ معرکہ آرائیاں بھی کرتا رہا۔ مندروں اور وہاروں کی تعمیر اور بداعتقادوں کی تخریب نیز اُن کی جائیداد کی قرقی کا نظارہ بھی دیکھتے ہیں اور پھر یہاں قحط بھی پڑتے ہیں۔ سیلاب بھی آتے ہیں اور آگ کی وارداتیں بھی رونما ہوتی ہیں جن کے باعث آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ لقمہ اجل بن جاتا ہے اور جو بچ جاتے ہیں وہ مصیبت کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔

کلہن کشمیر کو ایک ایسا ملک قرار دیتا ہے جو بغاوت میں لطف محسوس کرتا ہے لیکن ان بغاوتوں اور انقلابوں کو فوجی حکمران اور مہم جو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں''۔(5)

نہرو کے ان خیالات کے تناظر میں کلہن نے ملکِ کشمیر کے بارے میں جو یہ لافانی خیال ظاہر کیا ہے اس کا مفہوم رنگ بدل بدل کے وقت وقت پر اہل کشمیر کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''کشمیر ایک ایسا ملک ہے جسے فوجوں کے ذریعہ تسخیر نہیں کیا جاسکتا بلکہ جسے پیار اور روحانی عنایتوں کی بدولت ہی جیتا جاسکتا ہے''۔



حوالہ جات

(1)- ہمارا ادب، مشاہیر نمبر 77-1976ء، کلچرل اکادمی سرینگر۔ 1978، ص 431-430

(2)- سٹرگل فار فریڈم اِن کشمیر، پریم ناتھ بزاز، کشمیر پبلشنگ کمپنی نئی دہلی۔ 1953، 41-40

(3)- دورِ بڈشاہی کا نامکمل ترجمہ راج ترنگنی اور اُس وقت کے ایسے دیگر تراجم کا اب کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

(4)- کلہن، سوم ناتھ در، ترجمہ مجید مضمر، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، 1992ء، ص: 12-10

(5)- راج ترنگنی یعنی بادشاہوں کے دربار کی عظیم داستان، ترجمہ رنجیت سیتارام پنڈت، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1977، ص ix-x-xi

قدیم یونان کا کلاسیکی ڈرامہ

پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کا زمانہ اور اُس سے پہلے اور بعد کا ایک مخصوص دور یونانِ قدیم میں فن، ادب، فلسفہ اور دیگر فنونِ لطیفہ کی نشاۃ الثانیہ کا عہد زرّیں تھا۔ یہی وہ دور تھا جب سقراط، افلاطون اور ارسطو نے فلسفۂ حیات وممات اور زندگی کے اخلاق وآداب کے لئے اچھوتے معیار واضح کئے۔ ہومؔر یونانی رزمیہ کا بابائے آدم بن کر سامنے آ گیا۔ سیفوؔ نے جنس کی جبلت کو اپنی رومانی شاعری کا بنیادی جزو بنایا اور دُنیا میں پہلی بار شدتِ جذبات اور لذتِ ہوس سے بھرپور عشق ومحبت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شاعری تخلیق کی۔ اُس زمانے میں قلم بند کی گئی ہیروڈوٹس کی تاریخ کو دنیا میں تاریخ کی اولین شیرازہ بندی کا شرف حاصل ہوا اور اس قدیم یونان میں جالینوس نے حکمت کے نئے چراغوں سے عوام کے لئے صحت یابی کی روشنی کو جلا بخشی۔

اسی زرّیں یونان میں اسیکائی لس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز کے المیہ ڈرامے اور ارسٹوفینیز کے تخلیق کردہ طربیے مکمل ڈرامے کی صنف میں فنی طور پر متعارف ہوئے۔

یونان کے کلاسیکی ڈراموں کو عام طور پر دیوی دیوتاؤں کے حالات پر مبنی دیومالا ہی سے اخذ کیا گیا ہے جنہیں ان فن پاروں میں انسانوں ہی کی طرح جذبات، محسوسات، خیالات اور اقدامات کے ماتحت کام کرنے والوں اور زندہ رہنے والوں کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ دیوتا ظالم بھی ہیں اور زانی بھی۔ وہ رحم کرنے والے بھی ہیں اور اپنے دشمنوں کو پتھر کے مجسّموں میں تبدیل کرتے وقت وہ کسی انسانی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

یونانی ڈرامے کی عوام کے سامنے پیشکش کا باقاعدہ آغاز اُس وقت ہوا جب اسے خمریات کے دیوتا ڈیونی سس یا باکس دیوتا کے اعزاز میں ایک سالانہ مقابلہ میں اداکاروں

کے ذریعہ متعارف کیا گیا۔ یونان کے شہر ایتھنز میں منعقدہ اس مقابلے میں ہر ڈرامانگار تین المیے اور ایک طربیہ پیش کرنے کا پابند تھا اور انعام یافتہ ڈرامانگار کے سر کو زیتون کے پتوں سے آراستہ ایک تاج سے سجایا جاتا تھا۔

ڈرامائی ادب میں المیہ ایتھنز میں لوگوں کے لئے ادوارِ قدیم ہی سے تفریح کا ایک محبوب ذریعہ تھا۔ اگرچہ رزمیہ بھی عوام کے سامنے گا گا کر پیش کیا جاتا تھا لیکن اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو بعد میں المیہ ڈرامے یا ٹریجڈی کے حصے میں آئی۔ الیاڈ اور اوڈیسی کے مصنف ہومر نے کتھارا نامی ایک تار والے ساز کے ساتھ اپنے یہ دونوں رزمیے گا گا کر دوسروں کو سنائے لیکن اس کی میٹھی آواز اور ترنم بھی سامعین کا دل نہیں لبھا سکے اگرچہ بعد میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر یہ دونوں تخلیقات ساری دنیا میں یکتائے زمانہ فن پاروں میں شامل کی گئیں۔

ڈراما یونانی زبان میں حرکت کو کہتے ہیں۔ اس کے پیش نظر اُس وقت یونان میں یہ دستور تھا کہ ڈرامانویس اپنی تخلیق کو سٹیج پر پیش کرنے کے عمل میں خود بھی شامل ہوتا تھا۔ اسے حکام کی طرف سے اداکار اور دیگر ساز و سامان فراہم کیا جاتا تھا جس کے لئے سرکار رقومات بھی بہم کرتی تھی۔ مگر ڈرامائی پیشکش کی کامیابی یا ناکامی صرف مصنف کی کارکردگی کا ماحصل تصور کی جاتی تھی۔ ان ڈراموں میں کسی عورت کو اداکاری کرنے کی اجازت حاصل نہیں ہوتی تھی کیونکہ ملک کے زعماء اور امراء اس خدشے میں مبتلا تھے کہ کہیں ان کی خواتین خانہ بھی اس لہو ولعب میں شریک ہو کر ان کی بدنامی کا باعث نہ بن جائیں۔ بعد میں خواتین اداکاراؤں نے ان ڈراماوں میں نقاب پہن کر حصہ لینا شروع کیا تاکہ ناظرین انہیں پہچان نہ لیں بصورت دیگر نوجوان اور خوبصورت لڑکے ہی دلکش نسوانی کرداروں کی اداکاری کرتے تھے۔

یونان کے کلاسیکی ڈرامے کی شاندار عمارت کو جس عدیم المثال زیب و زینت سے اسیکائی لس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز اور مزاح اور طنز نگار ارسٹوفینیز نے پیراستہ کیا اس کی

مثال دنیا کے کسی ڈرامائی ادب میں آج تک نہیں ملتی۔

اسیکائی لس (525-456 قبل مسیح) جسے یونان کا ''بابائے المیہ'' کہتے ہیں، ایتھنز کے متصل الیوسس کے قصبے میں پیدا ہوا۔ اسے بچپن سے ہی کھیل کود اور مبارزت کا شوق تھا۔ اس نے مراتھن میں پارسی بادشاہ دارا کی فوجوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا جس کا ذکر اُس نے اس قطعہ میں بھی کیا ہے جو اس کے لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

اسیکائی لس جوانی میں انگور کے ایک باغ میں کام کرنے لگا جہاں ایک روز ڈیونی سس نے خواب میں آکر اسے یہ بشارت دی کہ وہ المیہ کے فن کی طرف اپنی توجہ مبذول کرے اور اس شعبے میں اسے شہرت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد اسیکائی لس نے چھبیس سال کی عمر میں اپنا پہلا ڈراما تحریر کیا۔

اسیکائی لس نے اگرچہ اپنی انہتر (69) سالہ زندگی میں کئی ڈرامے لکھے لیکن اس کے تحریر کردہ صرف سات ڈرامے ہی موجود رہ سکے ہیں۔ باقی ستر سے نوے ڈرامے زمانے کی دست برد کا شکار ہو چکے ہیں۔

ان فن پاروں میں اگامیمنان سب سے زیادہ مشہور ہے جو اُس یونانی سپہ سالار کی الم ناک کہانی بیان کرتا ہے جس نے اپنے بھائی مینی لاس کے لئے اس لئے ٹرائے کے شہر پر چڑھائی میں حصہ لیا کہ مینی لاس کی بیوی ہیلن کو ٹرائے کے شہزادے پارس نے اغوا کر کے اپنی داشتہ بنالیا تھا۔

اس دس سالہ جنگ میں ٹرائے کا سارا شہر زمین بوس ہو گیا اور لاتعداد انسان اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ اس طویل جنگ کا آخری دنوں کا حال ہومر نے الیاڈ میں بیان کیا ہے جسے دنیا کی سب سے زیادہ پر اثر رزمیہ داستان کا مرتبہ حاصل ہے۔

اگامیمنان بعد میں اپنی بے وفا بیوی کلے تیم نیسٹرا اور اس کے عاشق ایجستھس کے ہاتھوں بڑی بے رحمی سے قتل ہوا۔

اسیکائی لس کے ڈراموں کی خاصیت یہ ہے کہ ان میں ڈرامانگار کے فنِ کمال کی

نزاکت اور تخیل کی بلندی ڈراما دیکھنے والوں یا پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو مسحور کر دیتی ہے اور اس فنکارانہ اظہارِ جذبات میں اسیکائی لس نے اپنے دو ہم عصروں سوفو کلیز اور یوری پیڈیز پر خاصی سبقت حاصل کر لی ہے۔

اسیکائی لس کے ڈراموں میں مذہب اور اخلاقیات کی قدروں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے جن کے ذریعے اس نے دیوی دیوتاؤں کے تئیں توقیر و تحسین کا اظہار کیا ہے اور گناہوں کی پاداش میں انہی کے ہاتھوں سزا پانے کے فلسفہ کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ اسیکائی لس کو ڈرامائی مقابلوں میں کئی بار اوّلین اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

سوفو کلیز (406-495ق م) یونان کا دوسرا امتاز ڈراما نگار ہے جو ایتھنز کے قرب میں کولونس کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس طرح سے وہ اسیکائی لس سے عمر میں تیس سال چھوٹا اور یوری پیڈیز سے پندرہ سال بڑا تھا۔ سوفو کلیز کا باپ ایک متمول اور بارسوخ شہری تھا جس نے اپنے بیٹے کو شاعری اور موسیقی کے فن میں تربیت دلانے کی غرض سے شاندار انتظام کیا۔ اس تربیت کے نتیجے کے طور پر سوفو کلیز نے رقص و نغمہ کی اس تقریب کی رہنمائی کی جو سلامس میں اس کے وطن کی فتح کے جشن کے موقعے پر منعقد کی گئی تھی۔

جوانی میں سوفو کلیز شراب اور عورتوں کا رسیا تھا۔ اس بات کا اظہار اس نے اپنے ہی ایک مکالمے میں کیا ہے جسے افلاطون نے درج کیا ہے۔ سوفو کلیز کہتا ہے ''میں اپنی پیرانہ سالی کا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے خواہشات کے عذاب سے آزاد کر لیا''۔

سوفو کلیز کے بھی صرف سات ڈرامے حوادثِ زمانہ سے محفوظ رہ سکے ہیں جن میں موضوعاتی طور پر ایک دوسرے سے منسلک تین المیہ ڈراموں پر مشتمل ''ایڈیپس ریکس'' اس کا لافانی شاہکار ہے۔ ایڈیپس بادشاہ، ایڈیپس کولونس میں اور اٹنی گنی نام کے اس مسلسل ڈرامے میں سوفو کلیز نے ایک ایسے بدقسمت بادشاہ کی غمناک کہانی بیان کی ہے جس نے تقدیر کے ہاتھوں آلہ کار بن کر اپنے باپ کو قتل کیا اور بے خبری میں اپنی ماں کے ساتھ شادی کر لی۔ جب اس کی ماں کو اس ہولناک عمل کا علم ہوا تو اس نے خودکشی کر لی اور ایڈیپس کو

بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑا۔

سوفوکلیز پر اغلام بازی کا بھی الزام ہے۔ پلوٹارک نے اپنی ''پیرا کلیز کے سوانح'' نامی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک سمندری مہم جوئی کے دوران سوفوکلیز ایک نوجوان رنگروٹ کی اُسی طرح بے تحاشا تعریفیں کرتا رہا جس طرح ایک عاشق اپنی محبوبہ کی تعریفوں کے پل باندھتا ہے۔ اس پر پیرا کلیز نے اُسے زبردست تنبیہ کی اور اسے خبردار کیا کہ ''ایک فوجی افسر کو نہ صرف اپنے ہاتھ پاک وصاف رکھنے چاہئیں بلکہ اسے اپنی آنکھوں پر بھی قابو رکھنا چاہیے''۔

ارسطو نے سوفوکلیز کے ایڈیپس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک مکمل المیہ ہے جس میں اس نے ایک ایسا اعلیٰ ترین معیار قائم کرلیا ہے جس کی بدولت اس کے بعد کے یونان میں بھی اسے عزت واحترام حاصل رہا۔

سوفوکلیز عمر دراز پا کر 406 ق م میں وفات پا گیا۔

یوری پیڈیز (406-480 ق م) میں سالامس کے جزیرے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اگرچہ ایک باوسیلہ اور باعزت شہری تھا لیکن اس کی ماں کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ نچلے درجے کے ایک گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور جڑی بوٹیاں بیچنے کا کام کرتی تھی۔ اسی تناظر میں اس کا حریف کامیڈی نگار ارسٹوفینیز اپنے ''مینڈک'' نام کے ڈرامے میں کہتا ہے کہ ''یوری پیڈیز خود پست ذات کا فرد تھا جس کی ماں سڑکوں پر میوے، پھول اور جڑی بوٹیاں بیچتی تھی''۔

یونانی دیو مالا میں یہ حکایت درج ہے کہ یوری پیڈیز کے باپ کو ایک غیبی آواز نے یہ مژدہ سنایا کہ اس کے ایک بیٹا ہوگا جس کی ہر فرد بشر عزت کرے گا اور جو شہرت اور مقبولیت کا پیکر ہوگا۔

یوری پیڈیز ایک بسیار نگار ڈرامانویس تھا۔ اس کے تخلیق کردہ ڈراموں کی تعداد پچھتّر سے لے کر بیانوے تک بتائی جاتی ہے جن میں صرف اُنیس ڈرامے محفوظ رہ سکے ہیں جو

آج بھی ہمارے جذبات میں جولانیاں پیدا کرتے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں ڈرامائی مقابلوں میں چار بار پہلا انعام حاصل کیا اور بعد از مرگ بھی اسے ایک بار اس اعزاز سے نوازا گیا۔

یوری پیڈیز کی زندگی کے آخری سال میگنیشیا اور مقدونیہ میں بسر ہوئے۔ اس نے اپنی پہلی بیوی ملیٹو کو بدچلنی کی بناء پر طلاق دی۔ اس نے دوسری شادی چایر نام کی خاتون سے کی لیکن اس کے بعد بھی وہ بدنصیبی کے عالم میں مبتلا رہا۔

یوری پیڈیز 406 ق م میں اُس وقت زخمی ہو کر فوت ہوا جب اس کے دشمنوں نے اس پر خونخوار کتے چھوڑ دیئے جو اسے لہولہان کر کے اس کی حادثاتی موت کا باعث بن گئے۔ یوری پیڈیز کو اگرچہ وطن سے دور پیلا کے مقام پر سپرد خاک کیا گیا لیکن اُس کے آبائی شہر ایتھنز میں بھی اس کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کی گئی۔

یوری پیڈیز کے زمانے تک یونانی ڈراما کمالِ فن کی رفعتوں کو چھو چکا تھا جس کی آبیاری یکے بعد دیگرے اسیکائی لس، سوفوکلیز اور ارسٹوفینیز نے کی تھی۔ یوری پیڈیز کے ڈراموں میں ''میڈیا'' سب سے زیادہ چونکا دینے والا جذبات خیز ڈراما ہے۔ اس کی کہانی ایک جادوئی حسینہ میڈیا کے ناقابل تسخیر عزم کے اردگرد گھومتی ہے جو اپنی سوکن کے ساتھ ساتھ اپنے دو بچوں کو بھی بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیتی ہے کیونکہ اس کے خاوند جیسن نے ایک دوسری عورت سے بھی شادی کی تھی۔ اس ڈرامے کا وہ آخری حصہ پڑھتے وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جس میں میڈیا اپنی سوکن کو اپنے بچوں کے ہاتھوں زہر میں ڈبویا ہوا ایک نیا لباس تحفہ کے طور پر بھیجتی ہے جسے پہنتے ہی یہ عورت تڑپ تڑپ کے مر جاتی ہے اور اس خوف کے مارے کہ اب اس کے بچوں کو بھی اس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا جائے گا وہ خود ہی انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

یونانی المیہ نگار عام طور پر اپنے ڈراموں کے درد بھرے انجام کو دیوتاؤں کی کارکردگی سے ہی تعبیر کرتے تھے۔ میڈیا کے اختتام پر بھی یوری پیڈیز کہتا ہے:

''دیوتا کئی صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ کئی باتیں عجیب وغریب طریقے سے اختتام کو پہنچتی ہیں جو ہم چاہتے ہیں کہ ہو جائے، وہ ہوتا نہیں اور جن باتوں کی ذرّہ بھر بھی توقع نہیں ہوتی انہیں دیوتا خود ہی سرانجام دیتے ہیں اور اس کہانی میں بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا ہے۔''

یوری پیڈیز کے ڈراموں میں ہزاروں ایسے مکالمے موجود ہیں جو آج بھی یادگار مقولوں کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''جب نیک سیرت لوگ مرجاتے ہیں تو ان کی نیکی خاک میں نہیں ملتی بلکہ وہ ان کے نظروں سے دور ہونے کے باوجود باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تک بُرے لوگوں کا تعلق ہے ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ سب ختم ہو کر انہی کے ساتھ دفن ہو جاتا ہے''۔

ارسٹوفینیز (388-444ق م) یونانی ڈراما نویسوں کی آخری معتبر کڑی ہے جو طربیہ ڈرامے اور طنزیہ نظمیں لکھتا تھا۔

اگرچہ اس کی پیدائش کا پس منظر اور حالات زندگی دستاویزی اور تاریخی شواہد کے ساتھ موجود نہیں لیکن عام طور پر ایتھنز ہی کو اس کی جائے پیدائش مانا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے سال پیدائش اور تاریخ وفات میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

ارسٹوفینیز کے بھی ایک درجن ڈرامے موجود ہیں جن میں اس نے اپنے ہم عصروں کے فن اور تخلیقی صلاحیتوں کا مذاق اڑایا ہے۔

ارسٹوفینیز کے طربیہ ڈراموں میں اُس وقت کے یونان میں معاشرتی بے راہ روی، مرد عورت کے آزادانہ جنسی اختلاط کا والہانہ پن اور سرکاری ایوانوں میں رشوت ستانی، بے ایمانی اور حسد وافتراق کی نشاندہی بار بار کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد میں ہی ایک ممتاز طنزیہ نگار اور نقاد کی صورت میں خاص وعام میں مشہور ہوا۔ والٹیر کا کہنا ہے کہ ''طربیہ وہ ہے جو معاشرہ کی بدکاریوں اور بدحرکتوں کو بولتی تصویر ہو''۔ اس لحاظ سے ارسٹوفینیز کے طربیہ ڈراموں کو بہترین طربیہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ ●☼●

موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی کشمیر کہانی

حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے بارے میں کشمیر میں اور بیرون ملک ایک خاص طبقہ سالہا سال سے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ یہ دونوں پیغمبر وادیٔ کشمیر میں مدفون ہیں۔

موسیٰ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ایک سو بیس سال کی عمر میں وادیٔ کشمیر کے شمال مغرب میں قصبہ بانڈی پور (قدیم نام بیت پور) میں انتقال کر گیا۔ جہاں آج بھی ایک پہاڑی پر ان کی قبر موجود ہے۔

مس سوزین اولسن بائبل کا حوالہ دے کر بیان کرتی ہے کہ "اور موسیٰ نے اُن سے کہا میں ایک سو بیس سال کی عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ اب میں نہ تو اندر آ سکتا ہوں اور نہ ہی باہر جا سکتا ہوں۔ لہٰذا آقا کا یہ حکم ہے کہ میں اُردن نہ جاؤں۔ موسیٰ نے مواب میں وفات پائی اور اسے وادیٔ کشمیر میں بیت پور کے مقابل دفن کیا گیا"۔ (1)

مس اولسن مزید لکھتی ہے کہ "لفظ بیت (ببتھ یا وبتھ) کشمیر میں دریا کو کہتے ہیں اور پور کے معنی ہیں خلیج یا دہانہ۔ اس طرح یہ کشمیر میں بانڈی پورہ بن گیا۔ اس جگہ پر جانے کے لئے پہلے تو ایک نشیبی چوبی پُل سے گذرنا پڑتا ہے۔ پھر ایک جنگل میں چڑھائی کر کے پہنچنا ہے جو چٹانوں اور بندروں سے گھرا ہوا ہے۔ یہیں پر موسیٰ کی قبر ہے۔ جس کے آس پاس لوگوں نے عقیدت سے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے پرچم لہرائے ہیں۔ اگر اس دشوار گذار قبر تک پہنچنے میں کوئی مقامی گائیڈ رہبری نہ کرے تو اس جگہ تک رسائی ناممکن ہے۔ یہاں پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ تو سراسر ایک جادو جیسا معاملہ ہے اور میں نے فوراً تاڑ لیا کہ

بائیل میں موسیٰ کے انتقال کے بعد اُس کی قبر کی جو جغرافیائی لحاظ سے نشاندہی کی گئی ہے وہ اس جگہ کے عین مطابق ہے۔ اگر اس جگہ کی حد بندی نہ کی گئی اور اسے دستاویزی شکل نہ دی گئی تو اس قبر کا حال بھی ناگفتہ بہ ہو جائے گا''۔

ایک مقامی مؤرخ اور تحقیق کار فدا محمد حسنین مس اولسن کے اس فریضے کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موسیٰ اس لئے کشمیر کی طرف بھاگ گیا کہ یہود قبائل نے اسے اور اس کے پیروکاروں کو کنعان سے بھگا دیا جسے آج اسرائیل کہتے ہیں۔ یہ واقعہ اس لئے بھی پیش آیا کہ موسیٰ ایک حبشی لڑکی سے عشق میں مبتلا ہو گیا جس سے اس کی قانونی شریک حیات مریم کو سخت دُکھ پہنچا۔ موسیٰ کے بھائی ہارونؔ نے عشق موسیٰ کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا اور اس نے مریم کے ساتھ مل کر موسیٰ کو قتل کرنے کی سازش کی جس کی شبہ پا کر وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔

بقول فدا حسنین تاریخ گواہ ہے کہ موسیٰ کے پیروکار بعد میں کشمیر میں آباد ہو گئے۔ کشمیر میں سرینگر سے 30 کلومیٹر دور شمال میں گوٹلی پورہ نام کا ایک چھوٹا سا دیہات آباد ہے جس کے مکین اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ میر عالم نقشبندی جو کب کا انتقال کر چکا ہے، 1982ء میں 120 سال کی عمر کا تھا اور اس کے بقول یہ بنی اسرائیل والے یعقوبِ اسرائیلی کی نسل سے تھے۔ اس کے بقول ''ہم کئی صدیاں پہلے مسلمان بن گئے اور اس سے قبل ہم بودھ مذہب کے پیروکار تھے''۔ (2)

بائبل کی تاریخی حیثیت کی کھوج لگانے والے محقق آج تک موسیٰ کی قبر کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں جو اُن کا قانون دہ تھا۔

خدا تعالیٰ نے موسیٰ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے ایک ایسی سرزمین عطا کرے گا جہاں دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہوں اور جہاں ایسی پہاڑیاں اور وادیاں ہوں گی جو بارانِ جنّت کا پانی پیتی ہیں۔ اسے اُس کے محبوب فلسطین کا وعدہ نہیں دیا گیا اور نہ اس وعدے میں بحرِ مردار کا ذکر ہے۔ یہ جگہ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف کشمیر ہے جسے جنتِ

ارضی کہا جاتا ہے۔

پروفیسر حسنین کے اس موقف کی تاریخی اور سائنسی تجزیہ نگاری کے آئینے میں پرکھنے اوراس کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

عربی مدرس اور قلمکار محی الدین حاجنی نے اس موضوع پر اپنی خیال آرائی کے تناظر میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔"جب میں نبو پہاڑی کے دامن میں گنذر بل دیہات کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے کہ آج سے تین ہزار دوسو سال قبل اسی دیہات کا نام خضر بل رہا ہوگا کیونکہ حضرت موسیٰ خضرؑ کی تلاش میں وادئ سینا سے مشرق کی جانب روانہ ہوا تھا۔ وہ آخر کار اسی جگہ پر پہنچا ہوگا جہاں حضرت خضر کے ساتھ اُس کی ملاقات ہوئی۔ اسی مناسبت سے اِس کا نام خضر بل رہو گا یعنی وہ جگہ جہاں خضر نے قیام کیا ہو۔ بعد میں گنذر بل ہوگیا، کیونکہ یہ گاؤں وادی کے ایک کنارے پر ہے جہاں چنگیاں بھی موجود تھیں جنہیں کشمیری میں گنذر کہتے ہیں"۔ (3)

حاجنی نے اگرچہ اس واقعہ کو ایک چشم دید گواہ کی نظروں سے ملاحظہ کر کے بیان کیا ہے لیکن اسے صحیح اور مستند ثابت کرنے کی خاطر جس تحقیقی سہارے کی ضرورت ہے وہ حاجنی کی تحریر میں کہیں نظر نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ کی مبینہ قبر کے آس پاس الگ تھلگ رہائش کرنے والے چند لوگوں کا ایک چھوٹا سا فرقہ آباد ہے جو اپنے آپ کو موسیٰ پیغمبر کے پیروکار بتاتے ہیں۔ اس قبیلے کے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کبھی قحط سالی یا کسی آفتِ سماوی کا مقابلہ نہیں کیا ہے اور ان کے پاس اشیائے خوردنی اور دیگر چیزیں وافر مقدار میں موجود رہتی ہیں۔ البتہ وہ صرف اس خوف میں مبتلا ہیں کہ مقامی مسلمان ان کی طرف سے موسیٰ اور اسرائیلیوں کی برابر تشہیر کرنے کے سلسلے میں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔

آج سے چند سال قبل اس قبر کے محافظ ولی ریشی کا انتقال ہوا جس کا یہ دعویٰ تھا کہ اُس کے خاندان نے گزشتہ نو سو سال سے اس مقدس جگہ کی حفاظت کی ہے۔ اس کے

بقول ''یہ عظیم پیغمبر موسیٰ کی قبر ہے۔ یہ قبر غیر معمولی طور پر مشرق اور مغرب کی سمت میں واقع ہے جبکہ مسلمانوں کی قبریں شمال جنوب کی سمت میں ہوتی ہیں۔[4]

فرنکویس برنیر نے بھی اس بارے میں لکھا ہے کہ ''کشمیر میں یہ یقین کیا جاتا ہے کہ موسیٰ کا اسی شہر میں انتقال ہوا اور اس کا مزار یہیں پر ہے۔[5] برنیر نے گویا ایک سنی سنائی بات کو اپنے سفرنامے میں درج کرلیا ہے جس کی تہہ تک پہنچنے کی اس نے بھی زحمت گوارا نہیں کی۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ روایت عام ہے اور اس پر اب تک مشرق و مغرب میں درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں کہ عیسیٰ صلیب پر جان بحق نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی روح نے جنت کی طرف پرواز کی۔ اس کے برعکس وہ کشمیر گیا۔ وہاں کچھ عرصے تک قیام پذیر رہا اور وہیں اس کی موت واقع ہوئی۔ وہ روضہ بل خانیار میں دفن ہے جو شہر سرینگر کے وسط میں ایک گنجان آبادی والا رہائشی علاقہ ہے۔

مشرق میں اس موضوع پر سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908ء) نے خیال آرائی کی۔ مرزا ہندوستان میں مرزائیوں یا قادیانیوں کے بانی تھے۔ انہوں نے اپنی متنازعہ فیہ کتاب ''مسیح ہندوستان میں''، جو 1899ء میں شائع ہوئی، عیسیٰ کے انتقال کے بارے میں عالمی سطح پر قبول شدہ نظریہ کو چیلنج کیا۔ اس کے بعد قادیانی عقیدے کے دیگر دانشوروں نے اسی نظریہ کی تبلیغ کی۔ اس تعلق سے مفتی صادق نے ''عیسیٰ کی قبر''، خواجہ نذیر احمد نے ''عیسیٰ جنتِ ارضی میں'' اور لندن مسجد کے سابق امام مولانا جلال الدین شمس نے ''عیسیٰ کا انتقال کہاں پر ہوا'' نام کی تصانیف تخلیق کیں۔

قادیانیوں کا یہ کہنا ہے کہ ان کا مذہبی رہبر مرزا قادیانی مسیح موعود ہے یعنی اس نے عیسیٰ کا دوبارہ جنم لیا ہے۔ قادیانی چونکہ ہندوستان میں عیسیٰ کی وفات کے اٹھارہ سو سال بعد پیدا ہوا اور ان کے مطابق عیسیٰ بھی کشمیر (ہندوستان) ہی میں جاں بحق ہوا لہٰذا قادیانی ہی مسیح موعود ہوسکتا ہے۔[6]

سن 115 عیسوی میں ویاسؔ کی تحریر کردہ سنسکرت کتاب ''بھوشیہ مہاپوران'' میں یہ واقعہ درج ہے کہ سن 78 عیسوی میں ایک راجہ شاؔلے واہن ہمالیہ کے پہاڑوں میں ایک چوٹی پر چڑھ گیا۔ وہاں اس راجہ نے ایک باوقار شخص کو دیکھا۔ جو گورا تھا اور جس کے کپڑے سفید تھے۔ شالے واہن نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟ جواب میں اُس شخص نے کہا مجھے ایش پترم (ایشور کا بیٹا) کی حیثیت میں جان لو جو ایک کنواری سے پیدا ہوا اور جو صداقت کے اصولوں کا پیروکار ہے۔ راجہ نے جب اُس سے اُس کے مذہب کے بارے میں سوال کیا تو جواب ملا، اے راجہ! جب سچائی ختم ہوئی تو میں ظاہر ہوا اور میرے کام کی وجہ سے کمینے اور خطا کار مصائب میں مبتلا ہو گئے اور میں نے بھی اُن کے ہاتھوں مصیبتیں اٹھائیں۔ جب اُس سے دوبارہ اپنے مذہبی عقائد ظاہر کرنے کا سوال کیا گیا تو اس نے کہا میرا مذہب محبت، صداقت اور دل کی پاکیزگی ہے اور اسی لئے مجھے عیسیٰ مسیح کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ اس شخص کے سامنے تعظیم کا مظاہرہ کرنے کے بعد چلا گیا۔(7)

سرینگر میں عیسیٰ کے چھوٹے سے آستانے کو اگرچہ عیسیٰ ہی کی قبر بتایا گیا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے لیکن مقامی مسلمان قرآن کریم کی روشنی میں عیسیٰ کے انجام کا تذکرہ زیرِنظر رکھ کر اس روضہ کو کسی یوز آسؔف کی ابدی آرام گاہ بتاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے آخری ایام کو کشمیر سے وابستہ کرنے اور ان کی آرام گاہوں کو بھی کشمیر سے ملحق کرنے کی جو ایک متنازعہ فیہ اور طویل بحث ایک عرصے سے جاری ہے۔ اس کے بارے میں جدید سائنسی طریقے کے استعمال ہی سے کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچنے کی راہیں وا ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان دونوں قبروں کو کھدوانے اور ان میں موجود آثار کو جدید ٹیکنالوجی سے پرکھ کر ہی ایک مستند رائے قائم کی جاسکتی ہے لیکن مسلم اکثریت والی وادیٔ کشمیر میں بقول والٹر لارنس ''جہاں عام لوگ زندہ پیر کی بہ نسبت مردہ بزرگ کے مزار کی زیادہ تعظیم و تکریم کرتے ہیں''۔(8) یہ تجویز قطعاً قابل قبول نہیں ہوگی۔

نتیجتاً یہ بحث ابھی بہت دیر تک رسائل و جرائد کے اوراق اور کتابوں کے صفحات کو

سیاہ کرتی رہے گی۔



حوالہ جات

(1)- عہد نامۂ قدیم ۔ استثناء، باب 31 ۔ آیت 3-2-1

(2)- انڈیا ٹوڈے میگزین، نئی دہلی ۔ 31 مارچ 1982ء

(3)- مقالات، نور محمدی پریس سرینگر، 1967ء، ص 99

(4)- انڈیا ٹوڈے، نئی دہلی، 31 مارچ 1982ء

(5)- ٹریلوز اِن دی مغل ایمپائر، ایس چاند اینڈ کونئی دہلی، 1972ء، ص 430

(6)- عیسیٰ کہاں وفات پا گیا، غلام نبی خیال، انڈیا ٹوڈے، نئی دہلی، یکم تا 15 جون، 1977ء

(7)- ایضاً

(8)- دی ویلی آف کشمیر، کیسر پبلشرس سرینگر، 1967ء ص 286

ذکرِ رُومیؔ اور اُن کے ہم عصر مشاہیر

مولانا جلال الدین رومیؔ کی شاعری اور فلسفے کے تعلق سے جب بھی میں اپنے خیالات کو قلم بند کرنے کا عزم کرتا ہوں تو اُن کے حوالے سے کسی بھی قسم کی خیال آرائی کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے پہلے ہی مجھ پر ایک رقت طاری ہو جاتا ہے جس کی ظاہری وجوہات کی توضیح وتشریح میرے لئے ناممکن بن جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کئی اور اصحابِ دل اور عقیدت مندانِ صدق وصداقت بھی اسی طرح اس ناقابل بیان حالتِ قلبی سے ضرور دوچار ہوتے ہوں گے۔ اس جنونی حالت کے پس پردہ دراصل حضرت مولاناؔ کی مثنوی کارفرما ہے جس کا باذوق اور گہرا مطالعہ قاری کو الٰہیات اور تصوراتِ الٰہی کی پراسرار دنیا میں لے جاکر اسے دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔

مولانا رومیؔ نہ صرف سارے مشرق بلکہ دنیا بھر کے لئے ایک صاحب کمال شاعر تھے جن کا فلسفۂ حیات تاریخ اسلام کے منور اوراق سے مرتب اور مزین ہے اور اسی وصل الٰہی کی جستجوئے پیہم انہیں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں میں شامل کرتی ہے۔ اس پس منظر میں مثنوی کی مدح میں یہ شعر برمحل اور موزون ہے کہ:

مثنوئ معنوئ مولوی
ہست قرآں درزبانِ پہلوی

جس طرح فردوسیؔ نے شاہنامہ تحریر کر کے دعویٰ کیا تھا کہ :

بسے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اُسی طرح مولانا رومؔی کے بارے میں بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کمالِ فن اور اظہار تحریر کی سربلندی کی بدولت سارے فارس کو تصوف کا ایک ابدی تصور بخشا اور وہ خود بھی اسی روحانی کیفیت کی پرورش میں اپنی زندگی کے چھیاسٹھ سال وجد وسرور کی دنیا کو آباد کر کے خود بھی لافانی بن گئے۔

یہاں پر میں ایک جملہ معترضہ لازماً درج کروں گا جس کی طرف غالباً توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثنوی رومی میں حکایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات کے ساتھ ساتھ پند ونصائح کے جوانمول موتی لٹائے گئے ہیں وہاں حضرت رومؔی نے اپنے پیغام کو زیادہ سے زیادہ عوام پسند بنانے کی غرض سے جگہ جگہ ایسی زبان اور اسلوب سے بھی کام لیا ہے جسے براہ راست فحش نگاری کہا جاسکتا ہے۔ حفظِ مراتب کا تقاضا ہے کہ ان کے اس نوع کے اشعار یہاں درج کرنے احتراز کیا جائے لیکن اس پس منظر میں مثنوی کو ''ہست قرآں درزبانِ پہلوی'' قرار دے کر مولانا کے تئیں نذرانۂ عقیدت بہت حد تک غیر موزون اور مبالغہ آمیزی کا برملا اظہار دکھائی دیتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ قرآنِ پاک میں اس قسم کی فحش گوئی کا ایک لفظ بھی نظر نہیں آسکتا۔ اس لئے غالباً میر عباس شوستری نے اپنی توہین اور مولانا رومؔی کی مذمت میں کہا ہے کہ:

ایں کلامِ صوفیانِ شوم نیست
مثنویٔ مولویٔ روم نیست

مولانا جلال الدین رومی 30 ستمبر 1207 عیسوی کو بلخ ،مزار شریف (موجودہ افغانستان) میں پیدا ہوئے اور 17 دسمبر 1273ء کو ترکی کے قونیہ شہر میں واصل بحق ہوئے جہاں اُن کا آستانہ دُنیا بھر سے عقیدت مندوں کو متواتر طور پر دعوتِ عشقِ الٰہی دیتا ہے۔

مولانا کی تصانیف میں سب سے زیادہ قبول عام ان کی مثنوی کو حاصل ہوا ہے جو پچیس ہزار اشعار پر مشتمل دین کی تفسیر، فلسفۂ حیات وممات، انسان کی باادب زندگی میں تصوف کا مقام اور خدا کے ساتھ قلبی قربت حاصل کر کے اس کی بارگاہ تک رسائی حاصل کر کے عظیم فلسفہ کا احاطہ کر لیتی ہے۔ مثنوی کو فارسی شاعری میں ایک ضخیم تخلیق کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس زمرے میں عربی میں الف لیلۃ ولیلۃ اور فارسی میں شاہنامۂ فردوسی کے علاوہ ابوبکر محمد ابن محمد ابن انباری (884-939ء) کی تصنیف غریب الحدیث کا بھی ذکر آتا ہے جو پینتالیس ہزار صفحات پر تحریر کی گئی ہے۔[1]

مثنوی کے علاوہ پیر رومؔی نے دیوانِ کبریا دیوان شمس تبریز، مجلس صبا، مکتوبات، فیہ مافیہ وغیرہ تخلیق کی ہیں۔ ان کی صوفیانہ منظومات کی تعداد اڑھائی ہزار بتائی جاتی ہے۔

مثنویٔ رومی کو مکمل کرنے میں مولانا کی زندگی کے پچیس سال صرف ہوئے۔ اس کے جملہ اشعار کی تعداد پچیس ہزار ہی بتائی جاتی ہے گویا ہر سال وہ اس کے صرف ایک ہزار ابیات تخلیق کر سکے۔ ان کی صوفیانہ منظومات کی تعداد اڑھائی ہزار ہے اور انہوں نے سولہ سو رباعیات تخلیق کی ہیں۔

مثنوی میں مولانا رومؔی کی ہنؔد کے ساتھ تصوراتی قرابت داری اور ہنؔد کی شاندار تاریخی روایات کا جلوہ بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک کہانی کا تعلق ایک سوداگر کے ساتھ ہے جو اپنے طوطے سے ہند کے طوطوں کے لئے ایک پیغام لے جاتا ہے۔ ایک اور کردار کے بارے میں یہ کہانی درج ہے کہ جب اس نے فرشتۂ اجل کو دیکھا تو وہ حضرت سلیمان کے پاس گیا اور اس سے گذارش کی کہ وہ اس کی جان بچانے کی غرض سے اسے ہندوستان بھیج دے۔ اس کے علاوہ مثنوی میں کئی کہانیاں اور واقعات کلیلہ ودمنہ سے لی گئی ہیں جو پنچ تنتر کا عربی اور فارسی روپ ہے۔

مولانا جلال الدین رومؔی نے دنیائے مشرق میں فکر وفن اور فلسفہ تصوف کے جو چراغ روشن کئے ان کے نور سے رفتہ رفتہ سارے جہاں کی ثقافتی اور روحانی دنیا منور ہوتی گئی اور

یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ میں بھی مولانا کو دنیا اور بالخصوص مشرق کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

مولانا کی شاعری میں تخیلات کی جولانی اور تفکرات کی روانی کے ساتھ ان کے روحانی کمالات کا جو ایک وسیع ترکینواس میں احاطہ کیا گیا ہے اس کی مثال مشرقی ادبیات میں ملنا محال ہے۔

مولانا چونکہ خود ایک فنافی اللہ شخصیت کے مالک تھے اور اس عالم وارفتگی میں وہ خود بھی رقص کرتے کرتے نیم بے ہوشی کی حالت میں گر پڑتے اور دیر تک ایک ایسی دنیا میں ان کا قیام رہتا جس کے اندرون کو واضح کرنا مشکل ہے۔ اس عمل کے اتباع میں ان کی وفات کے ساتھ ہی ان کے لاتعداد مریدوں نے ایک مخصوص صوفی رقص سماع کے نام سے متعارف کرایا جو آج بھی ترکی میں وہاں کی تہذیبی اور روحانی زندگی کا ایک خوبصورت پہلو ہے۔

یہ رقص درویشانہ رقاص لمبے لمے چغے اور اُونچی ترکی ٹوپیاں زیب تن کر کے دائیں سے بائیں جانب لہراتے ہوئے جسم و جان کے ساتھ دیر تک رقص کرتے ہیں اور اس طرح سے ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جس کے بارے میں امیر خسرو کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ جاتا ہے:

نمے دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم

بہر سُو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

اس مخصوص رقص کو سات منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے جنہیں ناچتے ناچتے طے کرنے کے بعد درویش رقاص فکر اور عشق کو ایک ہی لڑی میں پرو کر ایک عالمِ الٰہی میں وارد ہو جاتا ہے۔

یہ رقص آج بھی ترکی میں خاص طور سال میں مئی اور دسمبر کے مہینوں میں کیا جاتا ہے۔ مئی کے مہینے میں مولانا نے شہر میں قدم رکھا اسی لئے 10 سے 17 دسمبر تک اس جشن رقص کو شبِ عروسی کہا جاتا ہے کیونکہ انہی تاریخوں میں حضرت مولانا نے اپنے خالق حقیقی

کے ساتھ اپنا لافانی رشتہ جوڑ لیا تھا۔

15 رنومبر 1244ء کو درویش شمس تبریز کے ساتھ ملاقات نے مولانا رومی کی زندگی میں ایک انقلاب لایا۔ اس سے قبل شمس تبریز نے سارے مشرقِ وسطیٰ کا اس لئے سفر کیا تھا تا کہ اس کی زندگی میں کوئی آ کر اُس کا ہم راز اور ہم نوا بن جائے۔ ایک غائبانہ آواز نے ایک بار اس سے پوچھا ''اگر تمہاری یہ مراد پوری ہو جائے تو اس کے عوض تم اُس شخص کو کیا دو گے؟'' شمس نے فوراً جواب دیا ''اپنا سر''۔ یہ آواز پھر آئی ''تو ایسا ہے کہ جس شخص کی تمہیں تلاش ہے وہ قونیہ کا جلال الدین ہے''۔

5 ردسمبر 1248ء کی رات کو جب رومیؒ اور شمسؒ محو گفتگو تھے، شمس کے کانوں میں عقبی دروازہ سے ایک آواز آئی۔ وہ اُس طرف چلا گیا اور پھر اُسے کبھی دیکھا نہیں گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد شمس تبریز کو قتل کیا گیا اور اس اقدام میں مولانا رومیؒ کے فرزند علاؤ الدین کا بھی ہاتھ تھا۔ اس طرح سے شمس تبریز نے واقعتاً اس صاحبِ نظر کو پا کر اپنا سر قربان کر دیا جس کی اسے تلاش تھی۔ اصل میں شمس تبریز کے ساتھ زبردست قرابت کی وجہ سے مولانا رومیؒ کے عقیدتمند اور احباب رشک کی آگ میں جل بھن کر اس غیر انسانی حرکت پر اُتر آئے۔ اس سے قبل ان سازشی عناصر نے کئی بار شمس کو مولانا کی صحبت سے دور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مولانا کے دل و دماغ میں شمس کی عظمت اور عقیدت کا جذبہ کم ہونے کے برعکس روز بروز شدت اختیار کرتا گیا اور بالآخر اسے وہ دن بھی دیکھنا پڑا جب اُس کے روحانی قائد کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔

مولانا رومی اور شمس تبریز کی شناسائی کے واقعات حکایاتی اور افسانوی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثنویٔ روم کے مترجم مولانا سجاد حسین نے ایسے واقعات کا اس طرح تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ''مولانا کی زندگی میں شمس تبریز کی ملاقات کا واقعہ جس قدر اہم ہے اسی قدر یہ واقعہ معرضِ خفا میں ہے۔ ایک روایت کے مطابق مولانا ایک روز اپنے شاگردوں کے حلقہ میں رونق افروز تھے۔ چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر تھے کہ اچانک

شمس تبریز قلندرانہ انداز میں آپہنچے اور کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا یہ وہ چیز ہے جس سے تم واقف نہیں ہو۔ مولانا کا یہ فرمانا تھا کہ اچانک کتابوں میں آگ لگ گئی۔ مولانا نے شمس تبریز سے کہا کہ یہ کیا ہے؟ توانہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ چیز ہے جس سے تم واقف نہیں ہواور یہ کہہ کر مجلس سے روانہ ہوگئے۔ اس واقعہ سے مولانا کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ تمام گھربار اور شان وشوکت کو خیر باد کہا اور صحرا نوردی شروع کردی۔ ملک کے گوشوں میں شمس تبریز کو تلاش کرتے پھرے لیکن ان کا کہیں پتہ نہ چلا۔

مولانا کے مرید مولانا کی اس کیفیت سے چونکہ پریشان تھے لہٰذا مولانا کی پریشانی دور کرنے کی غرض سے انہی کے کسی مرید نے شمس کو مار ڈالا۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شمس تبریز کو ان کے پیر بابا کمال الدین جندی نے یہ کہہ کر مولانا کے پاس بھیجا تھا کہ روم جاؤ، وہاں ایک سوختہ جان ہے اس میں حرارت بھردو۔ شمس تبریز قونیہ پہنچ گئے۔ شکر فروشوں کی سرائے میں مقیم ہوئے اور ایک بار جبکہ مولانا نہایت تزک واحتشام سے ایک راستہ سے گذر رہے تھے شمس تبریز نے مولانا سے سرراہ دریافت کیا کہ مجاہدہ اور ریاضت کا کیا مقصد ہے؟ مولانا نے فرمایا اتباعِ شریعت۔ شمس تبریز نے کہا یہ تو سب ہی جانتے ہیں لیکن اصل مقصد علم اور مجاہدہ کا یہ ہے کہ وہ انسان کو منزل تک پہنچادے اور پھر حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا۔

علم کز تو ترا نہ بستاند

جہل زاں علم بہ بود بسیار

ان جملوں سے مولانا اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مولانا کسی حوض کے کنارے کتب بینی میں مصروف تھے۔ وہاں شمس تبریز آگئے اور مولانا سے دریافت کیا کہ یہ کیا کتابیں ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہیں ان کتابوں سے کیا غرض۔ اس پر شمس تبریز نے وہ کتابیں حوض میں پھینک دیں۔

مولانا کو سخت رنج ہوا اور فرمایا کہ میاں درویش تم نے ایسی چیزیں ضائع کر دیں جن میں نادر نکتے تھے اور اب ان کا ملنا محال ہے۔اس پر شمس تبریز نے وہ کتابیں خشک حالت میں حوض سے نکال کر مولانا کے سامنے رکھ دیں۔ مولانا حیران ہوئے تو شمس تبریز نے کہا یہ حال کی باتیں ہیں تم صاحبِ قال ان کو کیا جانو۔اس کے بعد مولانا شمس تبریز کے ارادت مندوں میں داخل ہو گئے۔

ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ایک حلوہ فروش مولانا کی درس گاہ میں آیا۔مولانا نے بھی اس سے حلوہ کی ایک قاش خرید کر کھائی جس سے مولانا کے احوال یکسر بدل گئے۔ بے اختیار اٹھے اور گھر بار چھوڑ کر نکل گئے۔ ایک عرصہ تک گم رہے۔ واپس آئے تو بالکل خاموش تھے۔جذبہ میں کسی وقت بولتے تو زبان پر اشعار جاری ہوتے۔یہی وہ اشعار ہیں جو بصورت مثنوی آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔(2)

شمس تبریز سے ملاقات کے بعد دس سال تک مولانا نے فارسی میں جو غزلیات تخلیق کیں انہیں بعد میں دیوان کبیر یا دیوان شمس تبریز کے نام سے منظر عام پر لایا گیا۔دیوانِ کبیر چالیس ہزار ابیات پر مشتمل ہے اور اسے تصوفِ الٰہی کا ایک عظیم کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

شمس تبریز کے ساتھ مولانا رومؔی کے روحانی اور فکری رشتے نے ان کے تصورات کی قندیلیں روشن کیں اور اسی صحبت کی بدولت وہ ''پیر رومی'' اور ''حضرت مولانا'' کہلائے۔ اس بارے میں مولانا اور درویش تبریزی کی قرابت داری کے بارے میں شمس تبریز کو اس شعر میں تحسین و توصیف کا خراج پیش کیا گیا ہے:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

تا غلام شمس تبریزی نشد

مولانا پر شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے قبل ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا اور وہ اپنا اکثر وقت درس و تدریس اور وعظ خوانی اور پند و فتویٰ جاری کرنے میں ہی گذارتے

تھے۔ اس کے بعد جب شمس تبریز سے ان کا روحانی رشتہ مضبوط ہوا تو انہوں نے ان دنیاوی مشاغل کو خیر باد کہا اور وہ ہر معنے میں ایک لااُبال اور خود فراموش صوفی کی زندگی گذارنے کی جانب متوجہ ہوئے۔ انہوں نے محویت اور استغراق کے عالم میں اپنی ضروریاتِ زندگی کو بھی بہت حد تک خیر باد کہا۔ وہ کبھی کبھی غذا کھاتے تھے اور بسا اوقات منہ میں ایک سیاہ ہلیلہ رکھ کر جگر اور معدہ کو ٹھنڈا رکھتے تھے۔ انہوں نے تن کے کپڑے بھی ضرورت مندوں کو دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح سے ان کا ذریعہ معاش صرف پندرہ دینار رہ گئے جو انہیں اوقاف کی طرف سے فتویٰ نویسی کے عوض دیئے جاتے تھے۔

شمس تبریز محمد بن ملی بن ملک داؤد تبریز میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ شیخ ابوبکر زنبیل باف اور شیخ زین الدین سنجاسی سے اور بابا کمال الدین جنیدی سے علوم باطن سیکھے پھر سیر و سیاحت کرتے ہوئے قونیہ پہنچ گئے۔

شمس تبریز 1246ء میں قتل ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا رومؔی نے سلسلہ مولویہ قائم کیا جس کے پیروکار آج بھی ترکی میں موجود ہیں۔

شمس تبریز کو اپنا مخدوم و مرشد بنانے کے بعد مولانا رومؔی نے اسرارِ حق کی گرہیں کھول دیں ان کا بیان اس شعر میں بھی واضح ہے:

بے دولتِ مخدومیٔ شمس الحقِ تبریز

نے ماہ تو اں دیدن و نے بحر توان شد

مولانا رومؔی کا عالم تصوف ایک ایسا عالم اسرار ہے جس میں دین، خدا پرستی، خدافہمی اور خداشناسی، پاکیزگی نفس، دنیاوی خواہشات سے دست کش ہونا اور اپنے سے کم تر ذی روح کی بھرپور ہمت افزائی اور دستگیری بنیادی فلسفہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ چونکہ مولانا رومؔی کو پیر رومی تسلیم کر کے ان کی محفل میں اپنے آپ کو مرید ہندی کہتے تھے لہٰذا اس تناظر میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے جس بہتر پیرائے میں تصوف کی نزاکتوں اور لطافتوں کی تشریح کی ہے یہاں پر اسے دہرانا اس موضوع کے ساتھ عین مطابقت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر

صاحب لکھتے ہیں کہ ''اس کا آج تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ صوفی کا لفظ کہاں سے آیا ہے۔ کسی نے اس کو صفا سے مشتق سمجھا ہے اور کسی نے اصحاب صفہ سے اس کا جوڑ ملایا۔ کسی نے کہا کہ یہ یونانی لفظ صوفی سے ماخوذ ہے جس کے معنی عرفان کے ہیں لیکن اب مسلم اور غیر مسلم محققین زیادہ تر اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے۔ درویش، خدا سے لو لگانے والا اور تنعم دنیوی سے گریز کرنے والا زاہد، رسول کریمؐ کی طرح کملی والا ہوتا تھا۔ یہ کملی عام طور پر صوف ہی کی ہوتی تھی جو ایک کھردری قسم کی اون کی بافت تھی۔ مسلمانوں میں صوفیہ سے کوئی اس کا قائل نہیں کہ وہ طرز فکر و تاثر اور طرزِ زندگی جسے تصوف کہتے ہیں۔ اسلام میں کہیں خارج سے داخل ہوئی۔ بعض صوفیوں نے اپنے سلسلے کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملایا ہے اور بعض نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ چیز رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کا عکس اور اخلاقِ نبویؐ کو قلب میں سمونے کا نام ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ رسول کریمؐ کی غارِ حرا کی خلوت، تصوف یا ولایت ہی کا دور تھا جو نبوت کا پیش خیمہ بن گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو تصوف یا انگریزی زبان میں Mysticism کہتے ہیں وہ دین کے ارتقاء اور اس کی گہرائی میں ہر جگہ پیدا ہوا ہے۔ ایک خاص انداز کے تصوف میں ہندو قوم سے زیادہ کسی نے غوطہ زنی نہیں کی اور ہندو دھرم ویدانت اور بدھ مت پر پہنچ کر اور ویدوں سے اوپنیشدوں کی طرف عروج کر کے فکر و عمل میں تصوف ہی تصوف بن گیا۔ عملی زندگی اور خیر و شر کی پیکار کو باطل ہونے سے بچانے کے لئے بھی بعض اہم کوششیں ہوئیں جن میں کرشن مہاراج کی طرف منسوب بھگوت گیتا تصوف کے حقائق کو عمل سے ہم آغوش کرنے کی ایک لاجواب کوشش ہے۔ اس کتاب وحدتِ وجود اور توحید کو جہاد علمی اور جہاد نفسی کے ساتھ اس طرح مربوط کیا گیا ہے کہ حیات گریز تصوف کی بہت سی خامیاں اس میں رفع ہو گئی ہیں۔ اس بنا پر علامہ اقبالؔ اس کتاب کے بے حد مداح تھے اور فرماتے تھے کہ ہندو قوم اس کتاب کی وجہ سے قابل مبارک ہے''۔ (3)

مولانا رومیؔ کا ذکرِ خیر کرتے وقت یہ حیران کن حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اُن کے عہد میں اُن کے ہم عصروں میں بھی ایسی ایسی تاریخ ساز شخصیات شامل تھیں جنہوں نے عرب وعجم کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیاء کے تقریباً ہر ملک میں دین الٰہی کے زریں باب تحریر کئے ہیں ۔کیا مولانا رومی کو یہ فیضانِ الٰہی حاصل تھا کہ جب اُن کے دور کے ساتھ ساتھ ایک سو سال پیچھے یا آگے کی طرف نظریں اٹھتی ہیں تو اولیائے کرام اور اللہ کے نیک تر بندوں کی ایک لمبی فہرست اذہان میں جلوہ گر ہوتی ہے۔اس طرح بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کو دنیائے مشرق میں تصوف کی اعلیٰ ترین قدروں کی تبلیغ وتلقین اور ان کی آبیاری کا عہد زرّیں کہا جاسکتا ہے۔

یہ بھی ایک خوش آئند حقیقت ہے کہ انہی ایام میں سرزمین کشمیر میں بھی کشمیری زبان میں تصوف کے دو علمبرداروں للہ عارفہ اور شیخ نور الدین نورانی نے مقامی زبان میں ادبیات کا آغاز کر کے مادرِ وطن کو اپنے زندہ وجاوید فلسفے کی دولت سے اپنی شاعری کا بیش بہا تحفہ عطا کیا۔

مولاؔنا رومی کے ہمعصروں کے اسمائے گرامی کی فہرست اگرچہ طویل بھی ہوسکتی ہے لیکن ان میں سے جو روحانیت اور کمال الٰہیت کی معراج سے بہرہ ور ہوئے ان میں خواجہؔ معین الدین چشتی غریب نواز (1141-1230ء)، شیخ فرید الدین عطّار (1119-1220ء)، ابن عربی (1165-1245ء)، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (1173-1237ء)، بابا فرید الدین گنج شکر (1179-1265ء)، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء (1238-1325ء)، امیر خسرو دہلوی (1253-1325ء)، بہاوالدین ذکریا (1170-1267ء) اور لال شہباز قلندر سیہوانی (1177-1274ء) وغیرہ شامل ہیں۔

برصغیر ہند میں علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری اور فلسفہ پر سب سے زیادہ مولاناؔ رومی کا اثر قبول کیا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے فارسی اور اُردو کلام میں تکرار کے ساتھ کیا ہے۔

فی الحقیقت رومیؔ اقبالؔ کے لئے اسی مرتبہ کے مالک تھے جو ورجلؔ کو ڈانٹے کی ادبی دنیا میں حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال نے ایک بار مولانا رومی کو خواب میں دیکھا اور

حضرت مولانا نے ان سے کہا ''گاؤ!''۔ عبدالواحد کے الفاظ میں ''اقبال غالباً وہ پہلا عظیم شاعر ہے جنھوں نے رومی کا ایک صحیح انداز میں مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال، رومی ہی کی ہمراہی اور رہبری میں مختلف سیاروں کی سیر کرتے ہیں جہاں وہ دنیا کی سربرآوردہ ہستیوں کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں جن میں منصور الحلاج، ناصر خسرو، طاہرہ سیّد، میر سیّد علی ہمدانی، غنی کشمیری، بھرتری ہری، مرزا غالب، جلال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا شامل ہیں۔ اقبال ان سبھی سے حق وصداقت کا درس بھی لیتے ہیں۔ اسی سفر کے دوران اقبال حضرت محمدؐ، حضرت عیسیٰؑ، گوتم بدھ اور زرتشت کے فرمودات کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔

جاوید نامہ کے اس تخیلاتی سفر کے دوران فلکِ زُحل میں امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی اور مُلّا طاہر غنی کشمیری کی زیارت کے ذیلی عنوان میں رومی، شاہ ہمدان اور غنی کا اس محبت اور عقیدت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

مجھ سے رومی نے کہا بھولو اسے جو کچھ ہوا
سامنے جو ہے اسے دیکھو ذرا
دیکھ یہ رنگین نوا شاعر غنی
جس کا ہے باطن غنی ظاہر غنی
نغمہ خواں ہے پیش سالارِ عجم
سیّد السادات وہ معمار تقدیر اُمم
جس کے کنبے ہی کے ذکر و فکر سے
درسِ اللہ ہو غزالی نے لیا
ایک درویش اور سلاطین کا مشیر
مرشد اہل کشمیر
خطہ کشمیر کو تازہ ہنر، تہذیب وصنعت

اور علم اس نے دیا

بن گیا کشمیر ایرانِ صغیر

جانتے ہو تم کہ اس کی اک نگہ

کھولتی ہے سَو گرہ

اٹھو اس کے تیر کو دو دل میں رہ (4)

مُریدِ ہندی علامہ اقبال نے اپنے پیر رومیؔ کے اعتقاد میں بے شمار منظومات اس شیخ عجم کو نذر کی ہیں جن میں چند ایک یہاں پر موقعہ و محل کی مناسبت سے پیش کی جاتی ہیں :

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے

وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی



یا مردِ قلندر کے انداز ملوکانہ

یا حیرتِ فارابیؔ یا تاب وتبِ رومی



ہم خوگر محسوس ہیں ساحل کے خریدار

اک بحر پرآشوب وپر اسرار ہے رومیؔ

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبالؔ

جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؔ



مرشد غزلے بیتے از مرشدِ روم آور

تاغوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے



بیا کہ من ز خُمِ پیر روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر زبادۂ عنبی است

عہدِ رومؔی سے قبل یا اس کے بعد جن بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی موجودگی کا ذکر ہوا ہے ان کے سوانح یا ان کے روحانی اور فنی کارنامے دہرانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ یہ وہ بقامت بہتر اور بقیمت بہترین شخصیات ہیں جن سے کوئی بندۂ خدا غیر واقف نہیں ہوسکتا۔ ان اولیائے کرام کی عقیدت مندی کا یہ عالم ہے کہ اگرچہ حضرت غوث الاعظم شیخ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ اپنی زندگی میں کبھی کشمیر تشریف نہیں لائے اور ان کی آخری اور ابدی آرام گاہ بھی بغداد ہی میں ہے لیکن وادیٔ کشمیر میں سلسلہ قادریہ سے منسلک ان کے پیروکاروں نے انہیں اپنے دلوں میں بار بار یاد کرنے کی نیک مساعی کے نتیجے میں جگہ جگہ ان کے نامِ نامی سے مقدس درگاہیں اور آستانے تعمیر اور منسوب کیے جن میں سرینگر شہر کے وسطی علاقہ خانیار میں حضرت کی شاندار زیارت گاہ مرجع خاص و عام ہے جہاں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی تعظیماً تھوڑی دیر قیام کر کے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ تاریخی درگاہ سارے کشمیر میں زیارت دستگیر صاحب کے نام سے مشہور و مقبول ہے۔

مولانا رومی اور ان کے ہم عصروں کے مابین براہِ راست مناظرہ یا بالمشافہ تعلق تاریخی اعتبار سے ثابت نہیں ہوسکا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے پاس جس واقعے کا تقریباً ہر تذکرہ میں ذکر موجود ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خواجہ فرید الدین عطؔار کے کلام سے رومی کے علاوہ سلطنت فارس کے کئی اور شعراء بھی متاثر ہوئے ہیں۔ مولانا رومؔی عطّار کو روح اور حکیم سنائؔی کو آنکھوں کی بینائی مانتے تھے۔ عطؔار کی ملاقات جب رومؔی سے ہوئی تو انہوں نے رومؔی کو گلے سے لگایا اور دعائیں دیں۔ (5) یہ ملاقات عطّار کی زندگی کے آخری دنوں میں ہوئی جب مولانا نوجوان تھے۔ بزرگ عطؔار نے اس موقعہ پر نوجوان رومؔی کو اپنی کتاب اسرار نامہ تحفے میں عطا کی۔

اس کے علاوہ حضرت رومی اور مندرجہ صدر اکابرین دہر کے مابین براہ راست کسی تعلق کا حوالہ موجود نہیں البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہو۔ اسی اثر پذیری کے نتیجے میں مشرقی دنیا علم و فضل، فلسفہ و تصوف اور ادب و تحقیق اور دینیات کی ایک عظیم وراثت سے مالا مال ہوئی ہے اور یہ دولت آج بھی مشرقی عوام کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

تاہم اس مقالے کے موضوع کی مناسبت سے اس میں کوئی ہرج نہیں کہ حضرت رومیؔ کے چیدہ چیدہ ہم عصر اکابرین کے حالات مختصر طور پر پھر ایک بار زمرۂ تحریر میں لائے جائیں تا کہ ان کے فدوی اور عالمِ اسلام کے ان روشنی کے میناروں کے متلاشی پھر ایک بار ان پاک اور مقدس سوانح پر ایک نظر ڈال کر ایک تازہ سرور قلبی اور فکری تشفی کی نعمت سے سرشار ہوں۔

یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ ان محبانِ الٰہی کے بارے میں صرف چند ایسے واقعات و کوائف بیان کئے جائیں گے جو سبق آموز، دلچسپ اور بصیرت افروز ہوں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری:

''جب سر پر آفتاب ضوفشان ہو تو روشنی کی تلاش کیوں کریں؟'' یہ قول زرّیں اُس محبوبِ خدا کا ہے جسے حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری غریب نواز اور خواجۂ اجمیر کہتے ہیں اور جو کائنات کے چاروں طرف اپنی عنایت اور کرم فرمائی کا سورج ہماری رہنمائی کے لئے روشن کرتا رہا اور ساری دنیا اس کے ابدی نور میں نہا گئی۔

حضرت صوفیاء کے سلسلۂ چشتی کے بانی تھے۔ وہ اگرچہ سیستان (مشرقی فارس) میں 1138ء میں پیدا ہوئے لیکن کئی مقامات یعنی بخارا، سمرقند، بغداد، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ میں ہمیں تعلیم حاصل کرنے اور اپنے سے بلند و بالا مرتبہ والے اولیائے اللہ سے استفادہ کرنے کے بعد 1190ء میں ہند میں اجمیر پہنچے۔ اُس وقت اجمیر کا حکمران مشہور راجپوت بادشاہ پرتھوی راج چوہان تھا۔ اُس کے دربار میں کئی جادوگر تھے جن کا سرغنہ اجے

پال تھا۔ خواجہ نے اس شہر میں اَنا ساگر جھیل کے پاس ڈیرا ڈال دیا۔ دریں اثناء جب اُن کے بارے میں یہ چرچا ہوا کہ ایک پاکباز درویش وارِدِ شہر ہوا ہے تو لوگ جوق در جوق ان کی صحبت میں آئے اور اسلام قبول کرتے گئے۔ ان معتقدین میں اجے پال بھی شامل تھا۔

حضرت خواجہ نے اس کے بعد راہِ صدق وصفا پر اپنا سفر جاری رکھا اور اپنے کئی مریدوں اور عقیدتمندوں کو ملک کے مختلف شہروں میں بھیجا تاکہ وہ دین اسلام کی تبلیغ و تشہیر کریں۔ ان میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ فرید الدین گنج شکر، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اور حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی وغیرہ شامل ہیں۔

اُن کے انتقال کے بارے میں روایت ہے کہ جب ان کا آخری وقت آ گیا تو وہ عشاء کی نماز کے بعد اپنے حجرے میں گھس گئے اور مصاحبوں سے کہا کہ مجھے ساری رات تخلیہ چاہیے۔ تاہم علی الصباح جب نمازِ فجر کے وقت اصحاب نے دروازہ کھٹکھٹایا تو حجرے کا دروازہ اندر سے بند پایا جو ہزار کوشش کے باوجود کھل نہیں سکا۔ پھر اسے بمشکل توڑ کر اندر دیکھا تو حضرت خواجہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور یہ جملہ ان کی پیشانی پر نور کی لکیر کی طرح چمک رہا تھا: ھٰذا حبیب اللہ و ماتَ فی حُبّ اللہ ۔ یہ 16/ مارچ 1236ء کی صبح تھی۔

حضرت کا آستانہ اجمیر میں واقع ہے جہاں یہ زیارت گاہ ہندو پاک کے علاوہ دنیا بھر سے زائرین اور محبان خواجہ کو کھینچ لاتی ہے۔ جن میں ہر مذہب اور اعتقاد کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ فرید الدین عطّارؔ:

ان حضرت کے بارے میں بیان ہے کہ اِن کے کلام نے مولانا رومیؔ کے علاوہ سلطنتِ فارس کے کئی شعراء کو بھی متاثر کیا۔ مولانا رومیؔ عطّار کو روح اور حکیم سنائی کو آنکھوں کا نور کہتے تھے۔ عطّار کی ملاقات رومیؔ سے اُس وقت ہوئی جب وہ عمر کی آخری دہلیز پر تھے اور رومیؔ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ انہوں نے نوجوان رومیؔ کو اپنی کتاب تحفے کے طور پر بخش دی۔

حضرت عطّارؔ 1230ء تک بقیدِ حیات رہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں ایک منگول

جنگجو نے قتل کیا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس منگول نے اُنہیں پکڑلیا اور قتل کرنے کی ٹھان لی تو ایک شخص سامنے آیا اور اُس نے منگول سے کہا کہ میں تمہیں چاندی کے ایک ہزار سکّے دوں گا ،تم اس کے عوض یہ قیدی مجھے دے دو۔ عطّار نے اس شخص کی بات کاٹتے ہوئے منگول سے کہا کہ مجھے ان سکّوں کے عوض بیچ نہ ڈالو کیونکہ یہ صحیح قیمت نہیں ہے۔ منگول نے عطّار کی بات مان لی۔ اس کے بعد ایک اور شخص عطّار کو خریدنے آیا اور اس نے بدلے میں گھاس پھوس کی ایک بوری پیشکش کی۔ عطّار نے فوراً منگول کو یہ مشورہ دیا کہ وہ یہ پیشکش قبول کرے کیونکہ اس کی اصلی قیمت واقعی گھاس پھوس سے زیادہ نہیں ہے۔ منگول اس پیچیدہ گفتگو سے پریشان اور غصّہ ہوا اور اس نے عطّار کا سر قلم کر ڈالا۔

فریدالدین عطّار نے اپنا تخلص اپنے ہی پیشے سے اخذ کرلیا۔ وہ دواساز اور عطر فروش تھے لہٰذا اسی مناسبت سے عطّار کہلائے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر روز پانچ سو مریضوں کا علاج اپنی ہی بنائی ہوئی یونانی ادویہ سے کرتے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کا شغل بھی جاری تھا۔

خواجہ عطّار کی تصانیف منطق الطّیر ، اسرار نامہ اور الٰہی نامہ رشد وہدایت کی اعلیٰ تعلیمات اور فلسفہ کا ایک خزانہ ہیں جن میں خاص طور پر انسان کے روحانی مرتبہ کو بلند کرنے کی ہدایت نمایاں ہیں۔

محمد علی ابن عربی :

ابن عربی سپین (ہسپانیہ) میں 1165ء میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں یہ ملک ایک متمول اور خوشحال علاقہ تھا جہاں یونانی ادب کے عظیم کلاسیک خاص طور افلاطون اور ارسطو کی تخلیقات کا پہلے عربی اور پھر لاطینی میں ترجمہ ہوا اور ابن عربی کے لئے ان کا مطالعہ بھی تین ابراہیمی مذاہب یعنی صیہونیت ،عیسائیت اور اسلام کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔

ابن عربی نے جوانی ہی میں اپنے روزمرہ کو اس طرح بانٹ رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں نصف وقت وہ قرآن پاک کی تلاوت میں گذارتے اور شریعت اسلامی کا مطالعہ بھی

کرتے اور باقی نصف وقت وہ احباب کی محفلوں میں صرف کرتے۔ اسی دوران ایک رات کو انہوں نے یہ غائبانہ آواز سنی۔ "اے محمد! ہم نے تمہیں اس لئے پیدا نہیں کیا"۔ تذکروں میں درج ہے کہ اس کے بعد وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک قبرستان میں پناہ لی۔ اسی چلہ کشی کے دوران انہیں حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ سے ہدایت وبشارت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد ابن عربی کو اس قسم کی بشارت وقتاً فوقتاً ملتی رہی۔

ابن عربی نے 35 سال کی عمر میں 1200ء میں سپین سے کوچ کیا اور پھر کبھی اپنے وطن مالوف میں واپس نہیں آئے۔ اس دوران مختلف ممالک میں قیام کے دوران انہوں نے اپنی منظومات تخلیق کیں جن کا موضوع تصوف کی راہ پر گامزن ہونے کے بعد وحدہٗ لاشریک کی متعین کردہ منزل کو پانے سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان منظومات میں کئی ایسی تخلیقات بھی موجود تھیں جن کے بارے میں نقادوں اور نکتہ چینوں نے ان پر فحش گوئی اور جذبات خیز منظر کشی کے الزامات عائد کئے۔ اس دباؤ کے تحت انہوں نے اپنے دفاع میں اپنی تخلیقات پر ایک تجزیہ بھی قلم بند کیا۔ ایک مثال یوں ہے:

جب میرا محبوب ظاہر ہو جاتا ہے
میں کس آنکھ سے اُسے دیکھوں؟
اس کی اپنی آنکھ سے
میری آنکھ سے نہیں
کیونکہ اسے کوئی اُس کی آنکھ کے سوا دیکھ نہیں سکتا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی:

ان کا اصلی نام بختیار تھا اور قطب الدین ان کے لئے خطاب قرار پایا۔ حضرت بختیار کاکی کا سالِ ولادت 1173ء ہے۔ وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی وفات سے صرف چند روز قبل اصفہان چلے گئے جہاں انہوں نے حضرت چشتی کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور اس طرح سے خواجۂ اجمیر کے پہلے جانشین مقرر ہوئے۔ اس کے بعد مرشدِ

روحانی نے قطب الدین کو خلافت اور خرقہ عطا کر کے انہیں ہدایت دی کہ وہ ہندوستان جا کر وہیں پر قیام کریں ۔خواجہ قطب الدین کی روانگی سے قبل خواجہ اجمیر نے ان سے کہا ''تصوف کی نیک راہ کو کبھی نہیں چھوڑنا اور اپنے آپ کو اس مقدس کام کے لئے ایک بہادر ثابت کرنا''۔ خواجہ قطب الدین جب دہلی پہنچے تو سلطنت دہلی پر سلطان شمس الدین التتمش کی حکمرانی تھی۔

حضرت بختیار کاکی کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ہر روز پچانوے رکعت نماز کی ادا کرتے اور تین ہزار درودِ شریف پڑھنا ان کا روز کا معمول بن چکا تھا۔

اُن کے معمول میں یہ بھی شامل تھا کہ جو کوئی چیز ان کی خانقاہ میں آجاتی اسے وہ غرباء اور مساکین میں تقسیم کرواتے ۔ اگر کوئی چیز موجود نہیں ہوتی تو وہ اپنے طلباء اور مریدوں سے کہتے کہ یہاں آنے والوں کو پانی پلانا تا کہ ہماری مہمان نوازی کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح قائم رہے۔

خواجہ بختیار کاکی کا انتقال بھی ایک غیر معمولی طریقے پر ہوا۔ ایک بار وہ ایک محفل سماع میں تھے کہ انہوں نے حضرت احمد جامؒ کا ایک شعر سنا جس کے معنی یوں ہیں:

جو لوگ تسلیم ورضا اور خود سپردگی کی شادمانی کی تلوار سے قتل ہو جاتے ہیں انہیں نادیدہ قوت کی طرف سے ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

یہ شعر سنتے ہی انہوں نے اپنی جان جاں آفرین کے حوالے کر دی۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا مزار دہلی میں قطب منار کے پاس واقع ہے۔ انہیں اپنے وقت میں ہی قطب القطاب، ملک المشائخ، رئیس السالکین اور سراج الاولیاء جیسے خطابات دیئے گئے۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر :

حضرت گنج شکر کھوتوال کے دیہات میں 1179ء کو پیدا ہوئے جو پاکستان میں لاہور کے متصل واقع ہے۔ ایک واقعہ کی رو سے ان کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے ولی

ہونے کی شہادت ملی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ رحم مادر میں تھے تو ایک روز اُن کی والدہ نے ایک پڑوسی کی اجازت کے بغیر اُس کے باغ سے آلو بخارا توڑ کر کھانے کی کوشش کی۔ یہ حرکت انجام دیئے جانے سے پہلے ہی اس کے پیٹ میں زبردست درد ہوا جس کی وجہ سے اس نے یہ میوہ کھانے کا خیال ترک کیا۔ حضرت گنج شکر سے محوِ کلام ہوتے ہوئے ایک روز اُن کی والدہ نے ان سے کہا "جب تم پیدا ہونے والے تھے تو اُس دوران میں نے کوئی ممنوعہ چیز نہیں کھائی"۔ حضرت مسکرائے اور کہا کہ جب آپ نے پڑوسی کے باغ سے بغیر اُس کی اجازت کے آلو بخارا کھانے کی کوشش کی تو میں نے ہی آپ کے پیٹ میں درد کی لہریں دوڑائیں تاکہ آپ یہ غلط حرکت نہ کریں۔

حضرت بابا فرید الدین نے ملتان میں مولانا منہاج الدین کی شاگردی میں حدیث، فقہ، فلسفہ اور منطق کے علوم میں مہارت حاصل کر لی۔

حضرت بابا فرید الدین اُن معدودے چند صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے چلہ معکوس کے مشکل ترین کام کو انجام دیا۔ یہ چلہ اس طرح سے کھینچا جاتا ہے کہ صوفی یا ولی کو اُلٹا لٹکا کر ایک کنوئیں کے اندر ڈال دیا جاتا ہے اور ایک رسّی سے اُس کی ٹانگیں باندھ کر اس رسّی کو کنوئیں کے اوپر ایک درخت کی سب سے اونچی شاخ کے ساتھ برابر چالیس دن تک لٹکایا جاتا ہے۔

حضرت سے یہ واقعہ بھی منسوب ہے کہ ایک بار انہوں نے ایک تاجر کو اونٹوں کے کاروان کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے دیکھا جن پر بوریوں میں کچھ لدا ہوا تھا۔ دراصل ان بوریوں میں کھانڈ بھرا ہوا تھا۔ حضرت نے جب اس تاجر سے اس سامان کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے کہا کہ ان بوریوں میں نمک بھرا ہوا ہے۔ حضرت نے مسکراتے ہوئے کہا، ہاں یہ واقعی نمک ہے۔ تاجر جب اپنی منزل کو پہنچا تو اُس نے بوریاں کھول کر حیرت سے دیکھا کہ ان میں نمک بھرا ہوا ہے۔ وہ شرمسار ہو کر حضرت کے پاس گیا اور ان سے معافی مانگ لی۔ نمک پھر چینی میں تبدیل ہوا۔ اس مناسبت سے حضرت کو گنج شکر

کہتے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء:

آپ 1238ء میں بدایوں، اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں جہاں آپ کا روضہ پاک واقع ہے۔ حضرت کو سب سے زیادہ واجب الاحترام ولی اور صوفی قرار دیا جاتا ہے۔

وہ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد دہلی چلے گئے۔ ان کے سوانح ابوالفضل ابن مبارک کی مشہور تصنیف آئین اکبری میں بھی درج ہیں۔

وہ حضرت فریدالدین گنج شکر کے مریدوں میں سے تھے۔ ان کے مریدوں کی تعداد چھ سو بتائی جاتی ہے جن میں نصیرالدین چراغ دہلوی، امیر خسرو، برہان الدین غریب وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت نظام الدین چشتی نظامی سلسلۂ صوفیاء کے بانی تھے۔ انہیں جو خطابات وقتاً فوقتاً دیئے گئے ان میں محبوب الٰہی، سلطان المشائخ، دستگیر دو جہاں اور قطب دہلی شامل ہیں۔

دہلی میں آپ کی درگاہ پر حاضری دینے والوں میں وہ لاکھوں عقیدت مند شامل ہیں جو ہر سال اس روضۂ مقدس پر آتے ہیں اور جن کا تعلق تمام مذاہب کے ساتھ ہے۔

حضرت امیر خسرو دہلوی:

ابوالحسن یمین الدین خسرو برصغیر ہندوپاک کی ثقافتی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے روحانی مرید تھے اور ان کی قربت کو وہ اپنے لئے سب سے زیادہ پسندیدہ عمل سمجھتے تھے۔ ایک برگزیدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ماہر موسیقار بھی تھے۔ ان کا اکثر کلام اگرچہ فارسی میں ہے لیکن انہوں نے ہندوی زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ انہیں طوطیٔ ہند کے علاوہ بابائے قوالی بھی کہا جاتا ہے۔ قوالی کو ہندوستان میں عقیدتی موسیقی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ وہ خیال اور ترانہ طرز کی موسیقی کے موجد تھے۔ انہوں نے غزل، مثنوی، قطعات، رباعی، دوبیتی اور ترکیب بند جیسی اصناف سخن میں خوب

طبع آزمائی کی ہے۔

امیر خسرؔو شمالی ہندوستان میں پٹیالی اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔خسرو نے اپنی زندگی میں سلطنتِ دہلی کی سات حکومتوں کے ادوار دیکھے۔یہاں پر ان کی ایک مشہور فارسی غزل کو اس لئے نقل کیا جاتا ہے کہ اس کے مطلع کو کشمیری زبان کے مشہور شاعر پیر عزیز اللہ حقانی نے اپنی حسین ترین نعتیہ غزل کے مطلع میں ہو بہو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔

امیر خسرؔو کی غزل کے چند اشعار یوں ہیں:

گفتم کہ روشن از قمر گفتا کہ رخسارِ من است
گفتم کہ شیریں از شکر گفتا کہ گفتارِ من است

گفتم طریقِ عاشقان گفتا وفاداری بود
گفتم مکن جور و جفا گفتا کہ ایں کار من است

گفتم کہ مرگِ عاشقاں گفتا کہ دردِ ہجر من
گفتم علاجِ زندگی گفتا کہ دیدارِ من است

گفتم کہ حوری یا پری گفتا کہ من شاہِ جہاں
گفتم کہ خسرؔو ناتواں گفتا پرستار من است

اور اب اس غزل کے مطلع کے ساتھ حقانی کی نعت کے اس شعر کا تقابلی مطالعہ کریں:

گو وجہان تازہ بہ رخسارِ رسولؐ عربی
رؤٹ گلو مشک زگفتار رسول عربیؐ

حضرت بہاؤ الدین زکریا:

پاکستانی شہر ملتان رگ وید کے زمانے سے موجود ہے جس کے بارے میں مذکور ہے کہ وید اسی شہر میں لکھے گئے۔اس کے بعد اس شہر کا دوسرا نام مدینۃ الاولیاء بھی پڑ گیا۔ حضرت زکریا 1182ء میں اسی شہر میں عالم ہست و بود میں آئے۔یہیں پر ان کا روضۂ شریف بھی ہے۔

حضرت زکریا سلسلۂ سہروردیہ کے علمبردار تھے اور ان کے عقیدت مندوں اور پیروکاروں میں کئی امراء شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ملتان میں ان کی خانقاہ کی زیارت چند منتخب لوگ ہی کر سکتے تھے۔ ان کے ساتھ یہ بات بھی منسوب ہے کہ وہ عام لوگوں سے سروکار رکھنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔

1848ء میں جب انگریزوں نے ملتان پر حملہ کیا تو یہ خانقاہ بہت حد تک برباد کی گئی لیکن بعد میں مخدوم شاہ محمود نے اسے اپنی حالت میں لانے کی غرض سے اس کی ازسرنو تعمیر کر لی۔

حضرت کا پورا نام شیخ الکبیر شیخ العالم بہاؤالدین ابو محمد زکریا القریشی الاسدی العاشمی تھا۔

حضرت زکریا کی حیات طیبہ کے بارے میں بہت کم معلومات تذکروں میں درج کی گئی ہیں۔

حضرت لال شہباز قلندر:

آپ سیہوان شریف سندھ میں پیدا ہوئے۔ انہیں ہندوپاک میں ایک عظیم صوفی کامل، فلسفہ دان، شاعر اور قلندر کی حیثیت سے ایک اہم مقام حاصل ہے۔

آپ کا تعلق سہروردیہ سلسلۂ صوفیاء کے ساتھ تھا اور وہ مولانا رومی کے علاوہ بہاؤالدین زکریا، فریدالدین گنج شکر، شمس تبریز اور سیّد جلال الدین بخاری سرخ پوش کے ہم عصر تھے۔

آپ نے سارے عالم اسلام کا دورہ کیا اور بعد میں ہندوستان آ کر یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو مذہبی قوت برداشت اور معاملات میں صبر وتحمل کا درس دیتے رہے۔

شیخ عثمان مارونڈی شہباز قلندر کے آباء عراق سے ہجرت کر کے مشہد ایران میں قیام پذیر ہوئے تھے جو اُن دنوں تہذیب وتدریس کا ایک اہم مرکز تھا۔ حضرت قلندر نے کئی زبانوں میں مہارتِ تامہ حاصل کر لی جن میں فارسی، ترکی، عربی، سندھی اور سنسکرت بھی شامل ہیں۔

وہ اکثر وبیشتر سرخ لباس زیب تن کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ لال کہلائے۔ وہ ساری عمر کنوارے ہی رہے۔

لال شہباز قلندر بار بار مولانا رومی کی تصانیف پڑھ کر ان کا حوالہ دیتے تھے۔ ان کے یہ دو شعر مشہور ہیں:

حیدریم قلندرم مستم
بندۂ مرتضےٰ علی ہستم
پیشوائے تمام رِندانم
کہ سگِ کوئے شیر یزدانم

حضرت قلندر کے پیروکاروں میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، مخدوم بلاول، سچل سرمست اور قادر بخش بیدل مشہور شخصیتیں ہیں۔

اُن کے ساتھ کئی کرامات وابستہ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ جس پہاڑی پر وہ برسہابرس تک کراچی میں عبادتِ الٰہی میں محو رہے اس جگہ بعد میں گرم پانی کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا جس سے کئی انسانی بیماریاں آج بھی زائل ہو جاتی ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے ہم عصر مشاہیر میں اور بھی کئی تاریخ ساز ہستیاں شامل ہوں گی لیکن اس مقالے میں ہم نے چند منتخب صوفیاء اور اولیاء ہی کو زیرِ تذکرہ لایا ہے او رخاص طور پر ان کے سوانح کے برعکس ان کے روحانی کمالات اور معجزات ہی کو نمایاں طو ر پر قلم بند کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان بزرگانِ عالی مقام کے صدقے اپنے امان میں رکھے اور ہمیں دکھوں اور تکالیف سے مبرّا ایک اطمینان بخش زندگی عطا کرے۔ آمین



حوالہ جات

(1)- قاموس المشاہیر، مرتبہ نظامی بدایونی، جلد اوّل ۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 2004ء؛ص23۔

(2)- مثنوی مولانا روم، دفترِ اوّل؛ ترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر دہلی ۔1976ء، ص3تا5۔

(3)- فکرِ اقبال ۔ بزم اقبال لاہور؛ 1992ء،ص 309-308۔

(4)- جاوید نامہ، منظوم اردو ترجمہ۔ پروفیسر سیّد سراج الدین ۔ اقبال انسٹی چیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر، 2007ء،ص 219-218۔

(5)- کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی، جلد اوّل، اردو اکادمی دہلی، اشاعتِ چہارم، 1993ء،ص911



علامہ اقبالؒ اور کشمیریات

سوالات اور توضیحات

سرزمین کشمیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس مطلع سے برصغیر کا سب سے بڑا شاعر اور دانائے راز علامہ اقبالؒ ایک خورشید تاباں کی طرح طلوع ہوا۔ اقبالؒ وہ واحد سخن گو ہیں جنہوں نے اپنے کشمیری الاصل ہونے پر بار بار مسرت اور شادمانی کا اظہار بھی کیا اور ساتھ ہی یہاں کے اُس دور کے ناگفتہ بہ حالات کی بھی بھرپور عکاسی کی جب کشمیر شخصی راج کے جبر و استبداد کے شکنجے میں پھنس کر کراہ رہا تھا تو اقبالؒ نے اپنے کلام میں بار بار اہل کشمیر کی غلامی کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کر کے اس ''نجیب چرب دست اور تر دماغ'' قوم کی بے کسی اور بے بسی سے سارے مشرق کو آگاہ کیا۔

بدقسمتی سے اقبال اور کشمیر کے تناظر میں چند ایسی غلط بیانیاں اور بے بنیاد اختراعات بھی سامنے آئی ہیں جن سے ہماری نئی نسل کو باخبر ہونا چاہیے تاکہ وہ اس تکلیف دہ مسئلے کو آئندہ پیش آنے سے روک سکے۔

اقبالؒ اور کشمیر کے موضوع پر آج تک تین کتابیں اُردو میں شائع ہو چکی ہیں اور یہ تینوں ایک ہی عنوان یعنی ''اقبال اور کشمیر'' سے بالترتیب جگن ناتھ آزاد، صابر آفاقی اور سلیم خان گمی نے تصنیف کی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ تینوں تصانیف ایک ہی سال یعنی

1977ء میں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ صابر اورگمی کی کتاب کا سالِ اشاعت ایک ہونا غالباً اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اقبال 1877ء میں پیدا ہوئے اور 1977ء ان کے سویں سال پیدائش کے طور منایا جارہا تھا لیکن آزاد نے بھی یہی سال اپنی کتاب کی اشاعت کے لئے کیوں چن لیا، وہ عمل اقبال کی پیدائش کی صد سالہ تقریب سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے جو یوں ہے:

جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں ایک جگہ کشمیری سیاست دان شیخ محمد عبداللہ اور ایک کشمیری مبلغ مولانا احمد اللہ ہمدانی کو کشمیر کے ممتاز ترین قائدین قرار دے کر انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کی تردید سردار جعفری نے بھی اُسی وقت پرزور الفاظ میں کی تھی۔ ''جاوید نامہ'' کی اشاعت فروری 1932ء میں ہوئی اور ظاہر ہے کہ زیر بحث نظم اقبال نے اُس سے قبل ہی تخلیق کی ہوگی جس میں بقول آزاد شیخ صاحب کو نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے جب کہ اُس وقت شیخ محمد عبداللہ میدانِ سیاست میں محض ایک طفل مکتب تھے اور کسی بلند مرتبے پر نہیں پہنچے تھے۔

آزاد نے یہ مفروضہ اس ذاتی مفاد کی برآوری کے لئے گڑھ لیا کہ وہ اس سال کشمیر میں تعینات حکومت ہند کے ایک افسر کی حیثیت سے ریٹائر ہونے والے تھے اور مرکزی سرکار میں اُن کی ملازمت میں توسیع ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے اقبال اور شیخ کا فرضی رشتہ قائم کرنے کی غرض سے یہ کتاب اُسی سال منظر عام پر لائی اور شیخ صاحب اس چاپلوسی اور خوشامد سے اس قدر بشاش ہوئے کہ انہوں نے فوراً آزاد کو جموں یونیورسٹی شعبۂ اُردو کا صدر مقرر کیا اگرچہ آزاد صرف فارسی میں ایم اے کے ڈگری یافتہ تھے اور انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل نہیں کی تھی جو کسی بھی دانش گاہ میں کسی بھی شعبے کا سربراہ بننے کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔

اس غیر قانونی تقرری کے نتیجے کے طور پر آزاد کو جموں میں تاحیات ایک سرکاری

مکان بھی الاٹ کیا گیا اور علامہ اقبالؔ کے سوانح حیات لکھنے کے لئے ان کے حق میں پچاس ہزار روپے کا سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ آزادؔ نے یہ کتاب لکھنے کی تا دمِ مرگ کبھی زحمت نہیں کی۔

آزادؔ کے مفروضے کی تردید میں اقبالؔ کی نظروں میں شیخ عبداللہ کے مقام کا تعین اُس خط سے بھی کیا جا سکتا ہے جو علامہ نے شیخ کو 2/اکتوبر 1933ء کو یعنی ''جاوید نامہ'' کی اشاعت کے کم از کم بیس ماہ بعد لکھا اور جس میں انہوں اس کشمیری سیاست دان کو مکرمی یا محترمی یا صرف شیخ محمد عبداللہ صاحب کے الفاظ سے مخاطب ہونے کے برعکس صرف ڈیئر شیخ عبداللہ صاحب[1] کہہ کر مخاطب کیا۔ کیا یہ بات ایک حقیقی واقعہ کے طور پر قبول کی جا سکتی ہے کہ اس پس منظر میں علامہ عبداللہ کو اپنی ایک شعری تخلیق میں خراج عقیدت پیش کرتے؟

البتہ اس مختصر سے مراسلے میں علامہ نے ہندی مسلمانوں کے بارے میں ایک پیغمبرانہ پیشینگوئی کی ہے جو آج بھی مسلمانانِ ہند پر من وعن صادق آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہے بلکہ اس وقت بھی ہیں۔[2]

میری اُردو تصنیف ''اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر'' پہلے سرینگر میں 1997ء میں شائع ہوئی اور بعد میں اس کا طبع ثانی اقبال اکادمی پاکستان نے 1999ء میں لاہور سے شائع کیا۔

آزاد، صابر اور گمی کی اقبال پر کتابیں تصانیف کی نہیں بلکہ کتابچوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں ورق ورق فاش اغلاط سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں بر سبیل تذکرہ اس بات کو دہرانا ضروری ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی 210 صفحات پر مشتمل کتاب میں کم از کم 85 صفحات پر دوسروں ہی کے طویل اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔

علامہ اقبال جب جون 1921ء میں کشمیر تشریف لائے تو یہاں کے نشاط باغ میں انہوں نے ایک فارسی نظم ساقی نامہ لکھی جس کا موضوع کشمیر ہی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے اہل کشمیر کی غفلت اور ان کے عالم مجبوری میں زندگی گذارنے کے طرز عمل کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

کشیری کہ با بندگی خوگرفتہ
بُتے می تراشد زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے
خودی ناشنا سے زخود شرمسارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینۂ او دل بے قرارے

ان اشعار پر کشمیر میں اور خاص کر لاہور میں چند کشمیر نواز دانشوروں نے یہ اعتراض کیا کہ اس سے اہل کشمیر کی تضحیک ہوتی ہے لیکن حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اقبالؒ اپنی اس شاعرانہ سرزنش سے کشمیری عوام کو خوابِ غلامی سے بیدار کر کے حصول آزادی کی خاطر سر بکف ہو کر میدانِ کارزار میں اُترنے کی ترغیب دے رہے ہیں لہٰذا یہ اعتراضات محض ذاتی نکتہ چینی پر مبنی تھے جس طرح مولانا ظفر علی خان نے اُس وقت اقبالؒ پر طنز کیا جب اقبالؒ کو Knighthood یعنی سر کا خطاب دیا گیا۔ مولانا نے کہا:

ع سرکار کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبالؔ

اقبال اگر کشمیری قوم سے مایوس ہو چکے ہوتے تو وہ ایک عالم بے چارگی میں بھی جس میں کشمیریوں کے لئے محبت اور شفقت کی شدت اور حرارت شامل تھی، اس نوع کے اشعار نہیں کہتے کہ ۔

چہ بے پروا گذشتند از نوائے سحر گاہ من
کہ برد آں شور و مستی از سینہ چشمانِ کشمیری

یا وہ اس فکری اضطراب میں کشمیریوں کے تئیں یہ صدائے حق اور دعائے فردا بلند نہیں کرتے۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

اور

ازاں مئے فشاں قطرۂ برکشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اس مخالفت کی آواز کو دبانے کے لئے اقبالؒ نے خود 26 مئی 1923ء کو اُس وقت کے محکمہ امور خارجہ کے ایک افسر میر خورشید احمد کو اس مراسلے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ ''ساقی نامہ'' کشمیر کے متعلق بعض لوگوں کا گلہ سن کر مجھے تعجب ہوا۔ افسوس ہے کہ ہندوستان سے فارسی رخصت ہوگئی۔ سعدیؔ نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہوگی کیونکہ ایک زمانہ میں کشمیر ایران کا ہم سر رہ چکا ہے۔ میں نے تو دُکھڑا رویا ہے اور یہ بات سیاقِ اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع کشامرۂ کشمیر ہے نہ کہ کشامرۂ پنجاب۔ جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان کے لئے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آبا و اجداد اہلِ خطّہ میں سے ہیں۔''(3)

یہ تو مصلحت پسندی کی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہی معلوم ہوتی ہے کہ کشمیر اور اہل کشمیر کے بارے میں اقبالؔ کے ہمدردانہ اور مشفقانہ خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔ ایک طرف وہ کشمیریوں کی آزادی کے علمبر دار تھے لیکن دوسری جانب کشمیریوں کی غفلت شعاری، توہم پرستی اور تقدیر پسندی کے جذبات سے ہم آہنگ نہیں تھے کیونکہ وہ عمل اور جہد مسلسل کے پیامبر تھے اسی لئے وہ محمد دین فوقؔ کے نام 8/جون 1917ء کے خط میں

اہلِ کشمیر کی قبر پرستی پر ہر قلم کو حرکت دینے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ''کشمیر اور اہل کشمیر پر مختلف کتابیں لکھ کر آپ نے مسلمانوں پر اور ان کے لٹریچر پر احسان کیا ہے۔ البتہ کشامرہ کی قبر پرستی ایک ایسا مضمون ہے جس پر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا۔ اس طرف سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔''(4)

اور 19 دسمبر 1922ء کو فوقؔ ہی کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ ''اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کشمیر کے لوگوں میں خودداری کی روح پیدا کی جائے۔(5)

کشمیر کے حوالے سے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اقبالؔ نے اپنے خط میں جس سعدیؔ کا ذکر کیا ہے وہ حقیقتاً شیخ سعدیؔ شیرازی ہی ہے کیونکہ اقبال نے اس خط میں سعدیؔ کے ساتھ ایران کا بھی ذکر کیا ہے لیکن سعدیؔ کے اس مبینہ ہجو کا مسودہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ اسے دریافت کرنے اور منظر عام پر لانے کی بے حد ضرورت ہے۔

اقبال کے قیام کشمیر کے بارے میں بھی الگ الگ جگہوں کا نام لیا گیا ہے۔ عام طور پر یہی باور کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہاں دو ہفتے تک قیام کیا اور ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے۔(6) کشمیری سیاست دان مرحوم محی الدین قرہ نے تاہم یہ دعویٰ کیا ہے کہ علامہ نے خواجہ غلام محمد صادق کے والد عبدالغفار فارغ کے بٹہ مالو والے گھر میں قیام کیا۔(7) ان کے قیام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ لولاب میں مولانا انور شاہ کشمیری کے مہمان رہے اور جب سرینگر آئے تو جھیل ڈل میں عشائی باغ پل کے پاس رئیس بارہمولہ خواجہ عبدالصمد ککرو کے بنگلے میں ٹھہرے۔ یہ باتیں چھوٹی ہی سہی لیکن اس عظیم فرزند کشمیر کے سوانح کو ہر طرح سے مناقشات اور اختلافات سے صاف و پاک رکھنے کی خاطر ان باتوں کو تحقیق کے نتیجے میں صحیح تناظر میں پیش کرنا ضروری بن جاتا ہے۔

اگرچہ عام بیان کی رو سے اقبالؒ صرف ایک بار جون 1921ء میں ہی کشمیر آئے لیکن مہاراجہ کشن پرشادؔ کے نام اپنے 11/اکتوبر 1921 کے خط میں یہ انکشاف کرتے ہیں کہ ''امسال اگست میں ایک مقدمے کے لئے کشمیر جانے کا اتفاق ہوا''۔(8) اس بات

میں بھی ان کے قیام کشمیر کی صحیح تاریخوں کی تحقیق بھی دردست لینا مناسب ہوگا۔

اقبالؒ بلاشبہ مظلوم کشمیر کے مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کے سب سے بڑے حامی اور علمبردار تھے۔اس حوالے سے شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح عمری ''آتش چنار'' میں جو یہ انکشاف کیا کہ اقبال نے انہیں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی صلاح دی تاکہ اس میں غیر مسلموں کو بھی شامل کیا جائے محض ایک اختراع ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ اقبالیات سے متعلق دستاویزات خود ہی اس کی شہادت دیتی ہیں۔

مزید یہ کہ شیخ صاحب کے سوا اُس وقت کے سیاسی مصاحبوں میں سے کسی نے اس بات کا سرسری تذکرہ کر کے بھی اس کی توثیق نہیں کی ہے جو ان کے ساتھ لاہور جا کر علامہ سے ملاقی ہوتے رہتے تھے۔ان میں مولانا محمد سعید مسعودی، پریم ناتھ بزاز اور مولانا احمد اللہ ہمدانی، سعدالدین شال، نورشاہ نقشبندی، عبدالصمد ککرو، محمد دین فوق، بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔(9)

علامہ اقبال کا وطنِ مالوف اگرچہ کشمیر ہی ہے لیکن اس سلسلے میں اس امر کی آج تک کوئی مصدقہ شہادت نہیں مل سکی ہے کہ ان کے اجداد وادی کے کس دیہات یا قصبے میں رہائش پذیر تھے۔اس سلسلے میں اکبر حیدری کی طرح چند اور تحقیق کار اس بات سے منحرف ہیں کہ وہ جنوبی کشمیر کے کولگام ضلع کے سپرو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔علامہ نے البتہ از خود اس بات کی کسی حد تک وضاحت کی ہے۔اپنے برادر شیخ عطا محمد کے نام 5/اکتوبر 1925ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں ''آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔(10)

حضرت بابا لولہ حاجی کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے اُن کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا ہے۔والد مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا وہ بحیثیت مجموعی درست ہے۔خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے اس بارے میں اپنی تاریخ میں جو بیان کیا ہے وہ یوں ہے۔''بابا لولی حاجی پرگنہ آدون کے موضع چکو کے رہنے والے تھے۔

انہوں نے شادی کررکھی تھی ۔ وقت صحبت عورت کو اچھے نہ لگے اور یوں خلع ہوگیا۔ اس صورتحال نے دنیا سے اُن کا دل ٹھنڈا کردیا۔ وہ کعبہ چلے گئے اور بارہ سال کی سیاحت کے بعد کشمیر لوٹ آئے ۔ جہاں غیبی اشارے پر حضرت بابا نصرالدین کے مرید ہوگئے اور باقی عمر انہیں کی خدمت وصحبت میں بسر کی ۔ رحلت کے بعد اپنے پیر بزرگوار کے پہلو میں آستانۂ چرار میں آسودۂ خاک ہوئے''۔(11) اِس نوشتہ کے باوجود اقبالؔ کے آبائی مقام کا اب تک حتمی طور پر تعین نہیں ہوسکا ہے۔

مولانا عبدالمجید سالکؔ کی ادارت میں جاری ایک کشمیر نواز اخبار روزنامہ ''انقلاب'' لاہور کی 16/اگست 1931ء اور 29/اگست کے حوالے سے یہاں پر ایک اور واقعہ کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا مقصد علامہ اقبالؔ کی ذات گرامی کو بدنامی کے داغ سے آلودہ کرنا تھا۔ مولانا سالکؔ کے بقول ایک شخص گواشہ لال کول نے کشمیر کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے من جملہ دوسری غلط بیانیوں اور دروغ بافیوں کے، یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر اقبال نے میرے ساتھ ایک ملاقات میں کہا کہ ''ریاست کشمیر میں اس قدر بے چینی اور شورش پیدا کرنی چاہئے کہ بغاوت ہوجائے''۔ مولانا سالکؔ اس ملاقات میں موجود تھے ۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ علامہ نے اُس ملاقات میں گواشہ لال کول سے صرف اتنا ہی کہا کہ کشمیر میں ڈوگروں کو تو کسی تحریک کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ حکومت ان کی ہے ۔ باقی رہے کشمیری پنڈت اور مسلمان ، ان دونوں کو باہمی اتحاد کرکے اپنے حقوق کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ واضح رہے کہ پنڈت گواشہ لال کول ، جس نے بعد میں کشمیر کی تاریخ بھی لکھی، اس زمانے میں مرہٹہ پونا میں ایک مراٹھی اخبار کا نامہ نگار تھا۔(12)

آخر میں علامہ اقبالؔ کی طرف سے کشمیری شاعر غلام احمد مہجورؔ کے نام تحریر کردہ ایک خط کا بھی ذکر کیا جائے جس کے بارے میں بھی متضاد آراء پیش کی گئی ہیں ۔ یہ خط انہوں نے شاعر کشمیر کو 12/مارچ 1922ء کو لکھا جس میں وہ مہجورؔ سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں ۔ ''مجھے یہ معلوم کرکے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرۂ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں ۔ میں

کئی سالوں سے اسے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں مگر افسوس کسی نے ادھر توجہ نہ کی۔ آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔ افسوس ہے کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی اور نیز مسلمانانِ کشمیر کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی تلاش وحفاظت کے لئے ایک سوسائٹی بنالیں؟ ہاں شعرائے کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعرالعجم آپ کے پیش نظر رہنی چاہئے۔ محض حروفِ تہجی کی ترتیب سے شعراء کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا۔ کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھیں''۔ (13)

اس خط کے بارے میں جو خیالات ظاہر کئے گئے وہ کچھ اس طرح ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ''تصانیفِ اقبال کا تحقیقی وتنقیدی مکالہ'' میں اسے محمد دین فوق کے نام قرار دیا اور جگن ناتھ آزاد نے بھی آنکھیں بند کر کے یہی بات مان لی۔

شیخ عطااللہ نے ''اقبال نامہ'' کی پہلی جلد میں غلطی سے مکتوب الہ کا نام ظہورالدین لکھا۔ ان الگ الگ خیالات کا اظہار کرنے والوں نے اگر اقبالؔ ہی کا ایک مراسلہ مہجور کاشمیری کے نام پڑھا ہوتا تو یہ غلط فہمی خود بخود دور ہو جاتی کہ خط مہجورؔ کے سوا کسی اور کے نام تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مراسلہ علامہ نے 6/اپریل 1923ء کو مہجور کشمیری کے نام لکھا اور اس میں اس کشمیری شاعر کا اس لئے شکریہ ادا کیا کہ اس کی تحریر کردہ حیات رحیم (رحیم صاحب سوپوری) اقبالؔ نے نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی ہے۔ اسی خط میں یہ جملہ بھی درج ہے۔ ''بالخصوص کشمیر کے شعراء کے تذکرے کی طرف جلد توجہ دیجئے''۔ (14)



حوالہ جات

(1)- کلیات مکاتیب اقبال، جلد سوم، مرتبہ مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی، 1993ء، ص 402۔

(2)- ایضاً

(3)- ایضاً، جلد سوم، ص 449-448

(4)- ایضاً، جلد اول، ص 607

(5)- ایضاً، جلد سوم، ص 409

(6)- زندہ رود، جاوید اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، 1989ء، ص 424

(7)- خبرنامہ، کلچرل اکادمی سرینگر، ستمبر 1976ء

(8)- کلیات مکاتیبِ اقبال، جلد دوم، ص 281

(9)- اقبال اور تحریک آزادئ کشمیر، غلام نبی خیال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور 1999ء، ص 126

(10)- اس جستجو کے بارے میں اقبال نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا عملی پہلو کیا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے کن ماخذات سے استفادہ کیا۔

(11)- واقعات کشمیر، تاریخ کشمیر اعظمیٰ، ترجمہ ڈاکٹر حمید یزدانی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، 1995ء، ص 151۔

(12)- اقبال کا سیاسی سفر، محمد حمزہ فاروقی، بزمِ اقبال لاہور، 1992ء، ص 339-338۔

(13)- کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم 338-337

(14)- ایضاً جلد دوم، ص 441



اُردو تنقید اور توضیح

ارسطو نے جب ادبی تنقید کی اوّلین کتاب پوئٹکس یا بوطیقا تحریر کی تو اُس نے ادب کے حوالے سے ٹریجڈی یعنی المیے کو کامیڈی یعنی طربیہ پر فوقیت بخشی۔ اس ترجیحی پس منظر میں غالباً یونانِ قدیم کے اُس کلاسیکی ادب کا بھرپور اور اثر انگیز دور شامل تھا جس کے دوران اس ملک نے ڈراما کی صنف میں ایسے ایسے المیہ ڈرامے تخلیق کئے جو آج بھی خیال کی سربلندی، فنی پختگی، ترسیل کے زوردار اظہار اور بے مثال جذبات خیزی کے لحاظ سے شیکسپیئر کے کئی ڈراموں سے بہتر اور افضل ہیں۔

یونان میں پانچویں صدی قبل مسیح کا دور ڈرامائی ادب کی لافانی تخلیقات کا دورِ زرّیں کہلایا جاسکتا ہے۔ ان دنوں یونان میں ایک خاص وقفے کے بعد ڈراموں کے مقابلے ہوا کرتے تھے جن میں ہر مقابلہ میں تین المیے اور ایک طربیہ اعزازات کے لئے منتخب کئے جاتے تھے۔ المیہ نگاری میں ایسکائی لس، سوفو کلیز اور یوری پیڈیز نے اپنی ممتاز حیثیت کا جھنڈا گاڑ دیا اور طربیہ ڈراموں کی دنیا کو ارسٹو فینز نے مالا مال کر دیا۔ ایسکائی لس کا ایگا ممینان، سوفو کلیز کا ایڈی پس اور یوری پیڈیز کا میڈیا گزشتہ تین ہزار سال سے کلاسیکی ادب کے لاکھوں کروڑوں چاہنے والوں کے دل و دماغ کو متواتر طور پر ایک مسلمہ شدتِ تاثر کے ساتھ متاثر کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

یہاں یہ کہنا مناسب رہے گا کہ یہ سبھی ڈرامے منظوم تھے اور نثر میں نہیں لکھے گئے تھے۔ ارسطو نے بھی شاعری ہی کو تمام اصناف ادب میں دل نشین اور ممتاز گردانا ہے اور اپنی

تنقیدی کتاب کا عنوان بھی پوئٹکس یعنی شعریات ہی رکھا ہے۔

ارسطو کے تنقیدی نظریہ کا کمال یہ ہے کہ اس میں وضع کردہ اصول اور قواعد کم وبیش آج بھی مغربی ادب کے ساتھ ساتھ مشرق میں بھی اُردو ادبیات کے لئے مناسب اور معقول نظر آتے ہیں۔

ارسطو نے اسی لئے المیہ کو ادب میں ممتاز ترین صنف قرار دیا۔ اِس تعلق سے اُس کا کہنا ہے کہ المیہ میں کردار کو اُس سے زیادہ بہتر شکل میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے جیسا کہ وہ اپنی حقیقی دنیا میں ہوتا ہے جبکہ طربیہ میں اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ایک کمتر درجہ حاصل ہوتا ہے۔

اُردو زبان میں پوئٹکس کا ترجمہ عزیز احمد، جمیل جالبی اور شمس الرحمان فاروقی نے کیا۔ جمیل جالبی ارسطو کے تصورِ فن کی اپنے الفاظ میں یوں توضیح کرتے ہیں۔ ارسطو کے خیال میں المیہ خوف اور رحم دلی کے جذبات کو ابھار کر ایسے مقام پر لے آتا ہے جہاں پر وہ جذبات نہ صرف ماند پڑ کر ختم ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے برعکس امید اور ہمت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس عمل کے لئے ارسطو نے Katharsis کی ترکیب استعمال کی ہے۔ یہ عمل انسان کے اندر اسی طرح ظہور پذیر ہوتا ہے گویا ایک انسانی جسم میں دہکتا ہوا پھوڑا ایک خاص یونانی طریقہ علاج اور عمل سے اور بھی شدید تر اور تکلیف دہ بنایا جاتا ہے اور بعد میں ایک اور دوا کے استعمال سے مادۂ فاسد کو خارج کر کے جسم کو از سرِ نو توانا اور تندرست بنایا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر ارسطو کی رائے میں فن اصل میں نقل ہے اور یہ نقل المیہ میں اثر انگیز اور طربیہ میں مایوس کن ہوتی ہے۔

ارسطو المیہ میں چھ بنیادی عناصر پر تنقید کی عمارت تعمیر کرتا ہے جن میں پلاٹ یعنی کہانی، کردار، اسلوب، خیال، منظر نامہ اور نغمہ شامل ہیں۔ یہ ارسطو ہی تھا جس نے تنقید کو نقل یا Memesis یا Imitation کا نام دیا۔ وہ اس اصطلاح کو ہو بہو نقل سے تعبیر نہیں کرتا بلکہ وہ اس کے سہارے ہی ایک نئی تخلیق منظر عام پر لانے کو نقل کا نام دیتا ہے جو

نقل سے کئی گناہ بہتر ترکیب ہے۔

ہندوستان کے جدید ادب میں جن بے لاگ، ایماندار اور وسیع النظر نقادوں نے اُردو ادب کے لئے تنقید کی نئی راہیں متعین کیں ان میں الطاف حسین حالؔی، مولانا شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد کے بعد مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، امتیاز علی عرشی، عبدالرحمان بجنوری، آل احمد سرور، نیاز فتح پوری، سید احتشام حسین، مسعود حسن رضوی، سید محی الدین قادری زور، کلیم الدین احمد، وقار عظیم، جعفر علی خان اثر لکھنوی، حافظ محمود شیرانی، عبادت بریلوی، شیخ محمد اکرام، محمد حسن عسکری، سید ممتاز حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور خورشید الاسلام کے اسما سرفہرست دکھائی دیتے ہیں۔ اردو ادبیات کے مختلف ادوار میں اگر چہ کئی اور سرکردہ نقاد اور تحقیق کار بھی اپنی اپنی حیثیت میں نقد و نظر کے اس سرمایہ میں اضافہ ہی کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں لیکن ان سبھی کے نام درج کرنے کا نہ یہ موقعہ ہے اور نہ ہی اتنی مہلت ہمارے پاس دستیاب ہے۔

اُردو میں ترقی پسند ادب کی ہمہ گیر تحریک نے تنقید کو ایک نیا آہنگ دیا اور اس صنف ادب میں توضیح اور تشریح کے لئے کچھ ایسی تراکیب متعارف کی گئیں جن کی ہمہ گیر مقبولیت پر ایک سوالیہ نشان لگا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تنقید کو ایک مخصوص سیاسی نظریہ کی پیداوار کا نام دیا گیا اور یہ سیاسی نظریہ اردو دنیا میں ترقی پسندی کے بقول ''رجعت پسند اور قنوطی دانشوروں'' کو قابل قبول نہیں تھا جو اسے براہِ راست اشتراکیت اور دہریت کا نام دیتے تھے ۔اس عمل کے ردعمل کے طور پر ہند میں ایک کمزور مگر متوقع تحریک جدید ادب کے نام پر شروع ہوگئی لیکن اس نے جنم لینے کے ساتھ ہی اپنا آخری سانس لینا شروع کیا کیونکہ ترقی پسند ادبی تحریک نے ایک قلیل مدت میں ہی برصغیر میں ادبی نظریات کو سرے سے ہی ایک تاریخ ساز تبدیلی کے تابع کیا تھا اور اس کے مرکزی فکر و خیال میں جس طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی سب سے عظیم نعمت یعنی زندگی کی شان اور سربلندی کو واضح کیا گیا وہ انسانی عظمت اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی سب سے شاندار مثال ہے۔

ادب میں جدیدیت کے نام پر جو شاعری معرض وجود میں آئی اس میں جا بجا خوبصورت تجربات کا بے ہنگم اظہار اور تفکر آمیز خیالات کو ابہام سے آلودہ کر کے بیان کرنا شامل تھا۔ یہ وہ ابہام نہیں تھا جس نے غالؔب کی شاعری کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ اس ادب کی گرہ کشائی کے دو ممتاز ماہر ہیں لیکن ان دونوں کی تنقید کو چونکہ ایک متنازعہ فیہ زاویہ سے دیکھا اور پرکھا جا رہا ہے لہٰذا میں نے حفظ مراتب کے تحت ان کی تنقیدی صلاحیتوں یا ان کے بے باک اور بے لاگ اظہار پر بحث کو فی الحال بالائے طاق ہی رکھا ہے۔

فنونِ لطیفہ کی گونا گو اصناف میں خواہ وہ ورطۂ تحریر میں لائی جائیں یا کسی اور ذریعہ ترسیل کی وساطت سے مشتہر کی جائیں، صرف شاعری ہی ایک ممتاز اور اعلیٰ و ارفع مقام کی حامل تصور کی جاتی ہے۔ دنیا کے اولین مورخ ہیروڈوٹس نے تاریخ کو یہ کہہ کر کسی حد تک نظر انداز کر دیا کہ تاریخ دراصل افسانہ ہے جسے دوہرا کر فرضی اور تصوراتی واقعات اور کہانیوں کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے لیکن شاعری کے بارے میں جیسا کہ کہا گیا ہے اس حقیقت میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ:

شاعری جزویست از پیغمبری

یا جس طرح سے ارسطو نے نہایت فخر و تمکنت کے ساتھ یہ شعر دہرایا ہے کہ:

To build from matter is sublimely great,

But only gods and poets can create.

دُنیا کے عظیم ترین ادبی قافلہ سالاروں نے قطع نظر اس کے کہ وہ نثر پر بھی خاصی دسترس رکھتے تھے، صرف شاعری ہی کو اپنا ذریعۂ خیال بنا کر سارے عالم میں ایک لافانی مرتبہ حاصل کیا۔ ہومر، ورجل، ڈانٹے، کالی داس، پشکن، حافظ، اقبال، شیکسپیئر اور ٹیگور کو ہم آج بھی صدیاں گزر جانے کے باوجود شاعروں کی ہی حیثیت میں جانتے ہیں اور ان عظیم سخن وروں کے فن اور فکر کی چوکھٹ پر اپنا سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

پیغمبروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان پر وحی کے ذریعہ آسمانی صحائف نازل ہوئے ہیں جنہیں وہ اپنی شگفتہ زبان میں دوسروں تک پہنچانے کا الٰہی فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ شاعری کے اُس اعلیٰ معیار کو جس پر رشک کیا جائے اگر زیرِ تجزیہ لایا جائے تو اس نوع کی سخن گوئی کو بھی الہام کا ہی درجہ دیا جائے گا۔ یہاں پر الہام کو بہر حال وحی سے الگ کر کے دیکھنا ہوگا۔

شاعری فکری معراج کے ماحصل کا نام ہے جیسا کہ علامہ اقبال نے گویٹے کے فاوسٹ کے بارے میں کہا تھا کہ اس سے زیادہ کمالِ فن ذہن میں نہیں آسکتا۔

کامیاب اور موثر شاعری میں انسان کی شعوری کاوش یا عذاب دہ غور و فکر کا عمل دخل ناکام اور بے جان سخن کو جنم دیتے ہیں۔ اسے فنی بلندیوں سے ہمکنار کرنے کے عمل میں سب سے زیادہ آمد کا حصہ ہوتا ہے۔ بہترین شاعری نور کے ایک دریا کی مانند ہے جو صدیوں سے رواں دواں ہے اور جس کے رُکنے یا تھم جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس جوئے نور کی تشکیل اور اس کی پیہم روانی میں انسانی عمل سے زیادہ شاعر کی خداداد صلاحیت بہت بڑا حصہ ادا کرتی ہے۔

گزشتہ نصف صدی سے اُردو ادب مجموعی طور پر ایک طرح کے دورِ انحطاط سے گذر رہا ہے۔ بھارت میں اُردو زبان کے تئیں جو سلوک روا رکھا گیا ہے وہ کسی بھی اُبھرتے ہوئے اردو ادیب کی حوصلہ شکنی کے لئے کافی ہے اور جب کسی زبان میں کوئی سر برآوردہ اور عظیم ادیب یا شاعر پیدا نہیں ہوتا وہاں نو واردانِ بساط ادب بھی اثر پذیری اور فیضان سے محروم ہی رہتے ہیں اور اپنے شوق کی منزل طے کرنے کی ان کی ہمت قدم قدم پر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس خلاء کے عالم میں تنقید کی نئی جہتوں کی جستجو اور مجموعی طور پر اس کے فروغ کا سلسلہ جاری و ساری رہنے کے برعکس خاموش اور ساکن جھیل کی لہروں کی طرح ایک ہی جگہ گویا تھم جاتا ہے۔

ضمناً یہ بھی کہیں کہ سرزمین کشمیر نے اُردو کی ادبی دنیا کے ساتھ سب سے زیادہ

قرب حاصل کیا ہے اور یہاں کے کئی شاعر، ادیب اور نقاد غالبؔ، میرؔ اور مومنؔ کے ساتھ علامہ اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ اور جگرؔ سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن اس وقت ان جیسی کسی عظیم المرتبت ادبی شخصیت کی غیر موجودگی میں اثر پذیری کی توقع اور تنقید کا سلسلہ جاری رہنے کی اُمید کم ہی کی جاسکتی ہے۔

اس کے باوجود اُردو دُنیا میں جو عاشقانِ اردو بغیر کسی نام و نمود کی خواہش کے ہم عصر ادیبوں کی قابل توجہ نگارشات کے بارے میں اپنا پرخلوص اور غیر جانبدارانہ تنقیدی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں ان کی اس اُردو نوازی اور اُردو سازی کے جذبے کو ہم سلام کرتے ہیں۔

اُردو زبان کے مالا مال اور سدا بہار ادب کا ایک یادگار دور احمد ندیم قاسمی اور پروین شاکر کے ساتھ ہی ختم بھی ہوا اور کسی حد تک وہیں پر اُس کے قدم رُک سے گئے۔ البتہ احمد فراز اور بشیر بدر کی خوش کن اور سرور بخش آواز ابھی ہمارے کانوں میں وقتاً فوقتاً امرت گھولتی رہتی ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا اچھی شاعری ہی اچھی اور صحت مند تنقید کو جنم بھی دے سکتی ہے اور اس کی پرورش بھی کرسکتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی ایک ایسی ہی شعری تخلیق مجھے بے حد پسند ہے، جس سے میں نے اپنی طرزِ نگارش اور بیانِ اسلوب کے ساتھ کشمیری میں منتقل کیا ہے اور یہی نظم یہاں پر آپ کو سنا کر آپ سے اجازت لیتے ہیں:

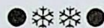
زندگی کے جتنے دروازے ہیں مجھ پر بند ہیں
دیکھنا حدِ نظر سے آگے بڑھ کر دیکھنا بھی جرم ہے
سوچنا اپنے عقیدوں اور یقینوں سے نکل کر سوچنا بھی جرم ہے
آسماں در آسماں اسرار کی پرتیں ہٹا کر جھانکنا بھی جرم ہے
کیوں بھی کہنا جرم ہے کیسے بھی کہنا جرم ہے
سانس لینے کی تو آزادی میسر ہے مگر
زندہ رہنے کے لئے انسان کو کچھ اور بھی درکار ہے

اور اس کچھ اور بھی کا تذکرہ بھی جرم ہے

اے ہنرمندانِ آئین وسیاست! اے خداوندانِ ایوانِ عقائد!

زندگی کے نام پر بس اک عنایت چاہیئے

مجھ کو ان سارے جرائم کی اجازت چاہیئے



کشمیری زبان میں مزاحمتی شاعری

1586ء میں مغلوں کی تسخیر کشمیر کے بعد کشمیری زبان کے شعراء ایک غیر موافق ماحول کے خلاف اگرچہ علی الاعلان اپنے قلم کو شعلہ بار نہ کر سکے لیکن مختلف فارسی جنگ نامے ان کی طرف سے کشمیر میں منتقل کیے جانے کا سلسلہ دراصل وفورِ جذبات کے اُس بالواسطہ اظہار بیان کا ردعمل تھا جو وہ کھل کر نہیں کر سکتے تھے۔ ان تراجم کا مقصد و مدعا یہی تھا کہ کشمیریوں کے دل و ماغ رزم و جزم کے کارناموں سے اس حد تک گرمائے جا سکیں کہ بیرونی قابضوں اور حاکموں کے خلاف ان کے غصّے اور نفرت کو برابر حدت اور حرارت ملتی رہے۔

مغلوں کے بعد پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں نے ملکِ کشمیر کو زیرِ تسلط لا کر استبداد کا نشانہ بنایا اور اہل کشمیر جور و جفا کے یہ دن خاموشی کے ساتھ گذارتے رہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب سارے برصغیر میں انگریز کے خلاف جہد و جہد آزادی نے ایک نیا موڑ لیا تو کشمیری شاعر بھی ڈوگرہ راج کے خاتمے کے لئے کمر بستہ نظر آنے لگے۔ اس طرح کشمیر میں پہلی بار واضح طور پر تحریک آزادی کے رجحانات کو شاعری کے دامن میں جگہ پانا نصیب ہوا۔

1947ء تک کشمیری زبان کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ مقامی طور پر ڈوگرہ حکمرانوں نے اس زبان کی پسماندگی کو قائم رکھنے کی غرض سے خاص کر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں ریاست میں اُردو کی ترقی اور ترویج کیلئے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کئی اقدامات کئے جو ڈوگروں کے آخری فرمانروا مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ اقتدار تک برار جاری

رہے اور اس دوران میں کشمیری زبان کو اپنے ہی گھر میں ایک بیگانے کا سا ثانوی درجہ حاصل رہا۔ بیرونی دنیا میں اس وقت کشمیر لاہور جیسے اُردو کے مرکز سے والہانہ اثر لے رہا تھا اور جب ریاست کی تحریکِ آزادی میں مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالکؔ، مولانا غلام رسول مہر، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، حفیظ جالندھری، محمد دین فوق، شورش کشمیری اور چراغ حسن حسرتؔ جیسے جادو نگار اہل قلم اور صحافیوں کی بھرپور حمایت شامل رہی تو لاہور اور پنجاب کے دیگر صحافتی مراکز کے اُردو اخبارات وادیٔ کشمیر کے ہر گھر میں روزمرہ کے مطالعہ کا ایک جزو لاینفک بن گئے۔

1947ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں جس طریقے پر مقامی حکومتوں کی اقتدار پرستی کا دور دورہ شروع ہوا وہ ہر جمہور نواز اور امن و قانون کا احترام کرنے والے ریاستی باشندے کو نا اُمید اور بددل کرنے کا باعث بنتا گیا۔ اس دوران میں ریاست میں جمہوریت کے ماتھے پر پے در پے دھبے لگائے گئے اور قومی مفادات اور ریاستی سلامتی کے نام پر انتہائی غیر جمہوری طریقے پر ریاست میں یکے بعد دیگرے حکومتیں تبدیل کی گئیں جس سے ساری ریاست میں لاکھوں عوام کے قلب و ذہن بدگمانیوں اور شکوک و شبہات کا شکار ہوتے گئے۔

اس بے لطف اور بے راہ رو سلسلے کا آغاز اگست 1953ء میں ہوا جب اس وقت کے ریاستی وزیراعظم شیخ محمد عبداللہ کو دہلی کی ایماء پر حکومت سے برخاست کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ شیخ صاحب کی غیر متوقع معطلی اور اسیری پر ریاستی مسلمانوں نے وسیع پیمانے پر مظاہرہ کر کے اس غیر آئینی اقدام کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں سینکڑوں بے گناہ شہری گولیوں کا شکار بن گئے جب کہ دوسری طرف جموں کے ڈوگرہ ہندوؤں نے شیخ صاحب کی برطرفی کے موقعے پر خوب جشن منایا اور نئے نامزد وزیراعظم بخشی غلام محمد کو جموں و کشمیر کا نجات دہندہ قرار دیا۔ اس سے قبل جموں میں متعصب انتہا پسند ہندو تنظیم پرجا پریشد نے پریم ناتھ ڈوگرہ کی رہنمائی میں شیخ محمد عبداللہ کے خلاف ایک ایجی ٹیشن چلائی تھی۔ اس ایجی ٹیشن کو تین فتنہ ساز نعروں یعنی ایک پردھان (وزیر یعنی وزیراعلیٰ) ایک

ودھان (یعنی ایک ہی آئین سازیہ) اور ایک نشان (یعنی پرچم) کے مرچ مصالحے کی آنچ دی گئی تھی۔

شیخ عبداللہ کی برخاستگی کے فوراً بعد کشمیری عوام پر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ شیخ عبداللہ امریکہ کے ساتھ ایک سازش میں ملوث ہوکر کشمیر کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست بنانے کی تیاریاں کر کے خود سلطانِ کشمیر بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔(1)

جب امریکہ کے ساتھ اس نام نہاد سازش کے افسانے کو دنیا بھر میں عوامی ذرائع ابلاغ نے ایک اختراع قرار دیا تو ایک نئی سازباز کے بعد شیخ محمد عبداللہ کو سینکڑوں کشمیری سیاست دانوں اور سرکار مخالف لوگوں کے ساتھ کشمیر سازش کیس میں ملوث کیا گیا۔اس مقدمے کی رو سے ان پر یہ الزامات عائد کئے گئے کہ وہ بیرونی طاقتوں کی مالی اور عسکری امداد کے بل بوتے پر ریاست جموں وکشمیر کی سرکار کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔یہ الزامات ایک طویل عرصہ تک مقدمہ بازی کے گورکھ دھندے میں الجھتے رہے اور جب یہ چال بھی الٹی پڑی تو ریاستی سرکار کو کشمیر سازش کیس اور حضرت بل کیس(2) اپریل 1964ء میں اُس وقت داخلِ دفتر کرنے پر مجبور ہونا پڑا جب اس کارروائی پر خزانۂ عامرہ کا کروڑوں روپے برباد ہو چکا تھا۔

ہمعصر کشمیری شاعروں میں جہاں وادی کے اکثر مسلم سخنوروں نے آزادی کے گیت گائے وہاں کشمیری الاصل غیر مسلم شاعروں یعنی پنڈتوں نے 1946ء میں ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کا نہ صرف یہ کہ قطعاً ساتھ نہیں دیا بلکہ وہ اس تحریک کو غنڈہ گردی سے تعبیر کر کے ہندوستانی حاکموں کو مختلف فرضی ناموں سے مراسلے اور برقیے بھیج بھیج کر گمراہ کرتے رہے۔اس سلسلے میں ہمارے پاس ایسی کوئی مثال موجود نہیں جس کی رو سے کشمیر کے غیر مسلم شعراء نندلال طالب ، ماسٹر زندہ کول ،دیناناتھ نادم ،المست کشمیری ، نند لال امباردار، دیناناتھ مست ، پی این پشپ ، امرچند ولی ،پریم ناتھ پریمی ،تریلو کی ناتھ کندن ،واسدیو ریہہ ،ارجن دیو مجبور ،سروانند پریمی وغیرہ نے تحریک کشمیر کے حق میں ایک بھی شعر تخلیق کیا ہو۔طرہ یہ کہ پریم ناتھ بزاز نے جب اپنے اخبار ''ہمدرد'' کے ذریعہ اس

وقت کے سب سے دراز قد قائد تحریک شیخ عبداللہ کے خلاف مخالفت اور نکتہ چینی کا بازار گرم کیا تو بزاز نے اس مطلب کی برآوری کے لئے ایک مقامی تنگ بند میر عبدالعزیز (ایڈیٹر ہفت روزہ انصاف راولپنڈی) کی خدمات بھی حاصل کیں جوز ہر پاش، مرچ پاش اور نمک پاش کے فرضی ناموں سے ''ہمدرد'' میں شیخ محمد عبداللہ اور تحریک آزادی کشمیر کے خلاف اپنی دشنام طرازی فکاہیہ منظومات کی شکل میں شائع کرواتا رہا۔

دورِ جدید کے کشمیری شعراء میں غلام احمد مہجورؔ اور عبدالاحد آزاد کو تحریک آزادی کشمیر کے نقیبوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ غلام احمد مہجورؔ اگر چہ ساری عمر سرکاری ملازمت ہی سے وابستہ رہا اور اس تعلق سے وہ براہِ راست اپنے وطن کے حال زار پر خامہ فرسائی کر کے سیاست گری کے جرم کا مرتکب نہیں ہوسکتا تھا لیکن اس نے اہلِ کشمیر کے درد اور حزن وملال کو ایک حساس تخلیق کار کی طرح خود اپنے دل میں محسوس کرلیا تھا اور یہ شدید احساس اس کی کئی انقلابی، سیاسی اور وطنی منظومات کی شکل میں ظاہر ہوا جن میں اردو نظم ''خطاب بہ مسلم کشمیر'' کے علاوہ اس کی کشمیری نظمیں، باغبان اے مہربان، اک نیا گلزار ہو، نیا کشمیر، اپنا باغ، گلشن، وطن، گل لالہ سے خطاب، زندگی کا ساز، مزدور سے خطاب، اے بادِ صبا، آزادی، جنگی ترانہ، نغمہ دہقان، اے بہادر کشمیری اور عہد و پیمان حضرت بل بھی شامل ہیں۔(3)

کلیات مہجورؔ کے مرتب کے بقول ''مہجورؔ کی شاعری بھی ہماری قومی تحریک کے دوش بدوش نشو ونما پاتی رہی ہے۔ کشمیر میں قومی تحریک کی وحدت وحرارت تیز ہونے کے ساتھ ساتھ مہجورؔ کی شاعری میں بھی شبنمی محسوسات ٹھنڈے پڑ گئے اور ان کی جگہ آتشیں خیالات نے لے لی۔ ایک ہمہ گیر قومی تحریک کو محض سیاسی نعرہ بازی اور چند اصولوں ہی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ کئی جمالیاتی قدروں اور تہذیبی عناصر کی بھی محتاج ہوتی ہے اور یہ ضرورت مہجورؔ نے پوری کرلی۔''(4)

اس طرح سے کموڈی کا یہ کہنا برمحل ہے کہ ''مہجورؔ کی شاعری اجتماعی شعور کی وہ علامت ہے جس نے تحریک حریت کشمیر کو جلا بخشی اور ایک کشمیری کو ''نیا کشمیر'' حاصل کرنے پر آمادہ

کرلیا''۔(5)

غلام احمد مہجورؔ کا انقلابی ترانہ ''اے باغبان''، شخصی حکومت کیخلاف جدوجہد آزادی کے دوران شیخ محمد عبداللہ عوامی جلسوں میں اکثر وبیشتر ترنم اور جوش بیان کے ساتھ گا گا کر محکوم اہل کشمیر کے دلوں میں جذبۂ حریت کا تلاطم موجزن کرتے رہے۔ اس مشہور نغمے کو کیفی اعظمی نے اُردو میں یوں منتقل کیا ہے :

چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر
کھلیں گل ہوں فدا بلبل تو وہ سامان پیدا کر
ابھی ویراں ہے پھلواری ابھی سونی ہے ہر کیاری
کہاں تک روئے گی شبنم بنا اشکوں کو چنگاری
کوئی ہل چل کوئی بادل کوئی طوفان پیدا کر
چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر
جدا ہوں رنگ پھولوں کے جدا ہوں ڈھنگ پھولوں کے
کبھی کانٹا نہ جان ان کو رہیں جو سنگ پھولوں کے
نیا ہر ڈھب نیا مذہب نیا ایمان پیدا کر
چمن والے چمن والوں کی کوئی شان پیدا کر
تری مشکل تری منزل تری منزل
سہارا دے کوئی تجھ کو تو پھر چلنے سے کیا حاصل
تو اپنا ہوش اپنا جوش اپنی آن پیدا کر

تابش صدیقی کے بقول ''مہجورؔ نے حب الوطنی کے موضوعات کو کشمیری شاعری میں داخل کیا۔ وطن کی مظلومیت پر آنسو بہائے۔ وطن کے پہاڑوں، ندیوں، چشموں اور مرغزاروں کے گیت گائے اور ان کے حسن کا ذکر کر کے اہل وطن کو وطن سے محبت کرنے کی تلقین کی''۔

مہجورؔ کشمیری میں شاعری کرنے سے پہلے سالہاسال تک اُردو میں سخن گوئی کرتا رہا

اور اسی دوران اس نے برصغیر ہندوپاک میں آزادی کی جوالا کو اپنی آنکھوں کے سامنے بھڑکتے ہوئے دیکھا تھا لیکن ساتھ ہی اپنے شاندار ماضی اور بے مثال ورثے سے مسلمانِ ہند کی چشم پوشی اس کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ ''خطاب بہ مسلم کشمیر'' مہجور نے اقبال کی نظم ''خطاب بہ نوجوانِ اسلام'' کے اتباع میں لکھی۔ یہ نظم جو 6 جون 1924ء کے اخبار ''کشمیر'' میں شائع ہوئی، شاعر کے وطن پرستانہ جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے تاریخ کشمیر کے محرکات سے بھرپور احساس کی ترجمانی ہے۔ مہجور کہتا ہے:

ترے اسلاف وہ تھے جن کے علم و فضل کے آگے
ادب سے جھکتے تھے دانشورانِ ہند و ایرانی
شہنشاہ معظم شاہ زین العابدین بڈشاہ (6)
کیا اکبر نے جس سے کسب آئین جہان بانی
بخوبی یاد ہے اب تک سخن سنجان عالم کو
غنی (7) کی خوش بیانی اور صرفی (8) کی سخن دانی
وہ شہنشاہِ باتقویٰ وہ فخر تاجِ چغتائی (9)
وہ جس کی زندگی کا شغل تھا دیں کی نگہبانی
ترے پیارے وطن کو قبہ اسلام کہتا تھا
گواہی کے لئے موجود ہیں احکامِ سلطانی

لیکن مہجور جیسے حساس شاعر کی ساری توقعات کے برعکس آزادی نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نام نہاد آزادی نئے نظام میں نئی بیماریاں لے کر آئی تھی جواب ہمارے معاشرے کا ناسور بن چکی ہیں۔

1947ء کے بعد اگرچہ ریاست جموں و کشمیر میں ایک عوامی حکومت کو برسر اقتدار لایا گیا لیکن اس حکومت کے کئی عاقبت نا اندیش کارندوں اور اربابِ اختیار نے آزادی کے نام پر دادا گری اور زور زبردستی کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا کہ اہل کشمیر نے آزادی کا جو

حسین خواب دیکھا تھا وہ رفتہ رفتہ استحصال، خویش پروری، اقرباء نوازی، غریب دشمنی اور سیاسی جبر واستبداد کے شب خون میں تبدیل ہو کے رہ گیا۔ مہجور کی طنزیہ نظم ''آزادی'' اسی دورِ ناہنجار کی بڑے تیکھے اور چبھتے ہوئے انداز میں ترجمانی کرتی ہے۔ اس نظم کو بلراج ساہنی اور پربھات مکھرجی کی تیار کردہ فلم ''شاعر کشمیر مہجور'' کے لئے کیفی اعظمی نے ہی اُردو کا منظوم روپ دیا تھا اور ایک مشہور بھارتی گلوکار منا ڈے اور اس کے ہم نواؤں نے اسے فلم کے لئے گایا تھا لیکن حکومتِ ہند کے احکامات کے تحت اس گانے کا ریڈیو یا ٹیلی ویژن سے نشر کیا جانا ممنوع قرار دیا گیا۔ مہجور کی اس معرکتہ آلاراء نظم کے چند بندیوں ہیں:

آزادی ہمارے گھر آئی آزادی کا کیا کہنا
آتی تو نہیں تھی پر آئی آزادی کا کیا کہنا
یہ محلوں پر منڈلاتی ہے سونا چاندی برساتی ہے
بس کھنڈروں سے شرماتی ہے جب آئی جھکا کے سر آئی
بھوکوں کو بہلائے کیسے پیاسوں پر چھلکائے کیسے
جنتا کو سمجھائے کیسے اوروں کی تجوری بھر آئی
سب روتے ہیں کچھ گاتے ہیں سب کھوتے ہیں کچھ پاتے ہیں
پھل محنت کے لٹ جاتے ہیں انصاف عجب لے کر آئی
آزادی ہمارے گھر آئی

ریاست میں عوامی راج کے سیاہ کارناموں کو مہجور نے اپنی ایک اور نظم ''گل لالہ'' میں یوں بے پردہ کیا:

اے گل لالہ! ذرا تو حالِ دل اپنا سنا
داغِ دل لایا جہاں سے اُس جہاں کی کچھ بتا
کیا وہاں بھی قتلِ آدم کے لئے ہتھیار ہیں
کیا وہاں بھی عورتوں بچوں کے دامن تار ہیں

کیا وہاں بھی دور دورہ چور بازاری کا ہے

کیا وہاں بھی راجِ افلاس اور بے کاری کا ہے

کیا وہاں مومن ہے بے کس اور بے دیں ہے امیر

کیا وہاں زردار کے ہاتھوں میں مفلس ہیں اسیر

کیا وہاں مظلوم پر ظالم کا استبداد ہے

کیا وہاں بھی اہل دانش کا چمن برباد ہے

کیا وہاں بھی حق پرستوں کے لئے بیداد ہے

کیا وہاں بھی چاپلوسوں کا جہاں آباد ہے

کیا وہاں بھی بے خطا ہیں اور ہے ظلم وستم

کیا وہاں بھی مجرموں کے ساتھ ہے لطف وکرم

کیا وہاں بھی دل ہی میں ہے شاعروں کے دل کی بات(10)

عبدالاحد آزاد کشمیری قوم کی حمیت اور آزادی کا اتنا بڑا عاشق تھا کہ اس قوم کی غیر پرستی اور غلامی کے حال سے اس کا دل تڑپ اٹھتا تھا :

ڈیکہ یُس الراوہِ عرشس فرش ہتھ وقتِ نیاز

سے ڈیکہ درواز نی پپٹھ کیا زِہ ترووتھ تی پزیا

(جس جبینِ نیاز کا ایک سجدہ عرش وفرش میں بھونچال لاسکتا ہے اس جبین سے تو کیوں غیر کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرتا ہے۔)

آزاد کا یہ شعر پڑھ کر بے ساختہ اقبال کی یاد آتی ہے۔

پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

آزاد نے اپنی ایک نظم ''مناظرہِ عقل وعشق'' میں کشمیر کی غلامی اور معاشی ابتریوں کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

سادہ مَنش کاشری کو نہ کر ان افسری

وچھتہ یہنز ابتری وچھتہ یہُند کاروبار

(سادہ لوح کشمیری حکومت کیوں نہیں کرتے۔ دیکھ ان کی ابتری اور ان کا خستہ حال کاروبار دیکھ۔)

یہاں پھر شاعرِ مشرق یاد آتے ہیں جنہوں نے کہا ہے:

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او

نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

عبدالاحد آزاد کی منظومات میں شکوۂ ابلیس، خودی، نالہ بڈشاہ، شکوۂ کشمیر، سرمایہ داری، نغمۂ بیداری، انقلاب، پیام انقلاب، دریا، وتستا، (جہلم)، میرا وطن وغیرہ آزادی اور غیروں کی غلامی سے حصولِ نجات کے شدید جذبے سے سرشار ہیں۔

آزاد کے ایک قریبی دوست اور ''کلیاتِ آزاد'' کے مرتب ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو نے اس دور غلامی اور آزاد کے ردعمل کی یوں تصویر کشی کی ہے۔ ''عبدالاحد آزاد اپنے اوائل عمر ہی سے وطن کی کسمپرسی دیکھ دیکھ کر کڑھتا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کے افلاس کے مناظر اور شخصی حکومت کے نیچے دبے ہوئے ہم وطنوں کی اُمنگوں کو دیکھ کر وہ تلملا اٹھتا تھا۔ جذبات اُبھرتے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہوتا تھا۔ اسے عوام کی کسمپرسی کے مناظر اور شخصی حکومت کے نقایص وطن کے چپہ چپہ پر کسی نہ کسی صورت میں نمایاں نظر آتے تھے۔ عوام اذیت کا شکار تو تھے ہی، سرکاری ملازم کا بھی یہی حال تھا۔ آزاد کا حساس دل یہ حال زار دیکھ کر روتا رہا اور وہ کشمیریوں کی زبوں حالی پر آنسو بہاتا رہتا۔ ''مناظرہ عقل و عشق'' میں اس نے کشمیریوں کی اسی بے کسی اور بے بسی کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔ (11)

عبدالستار عاصی پیشے کے لحاظ سے ایک مزدور تھا، لہٰذا اس کے کلام میں بھی مزدوروں اور محنت کشوں کے دُکھ درد کا اظہار ایک فطری عمل ہے۔ بقول مہجور ''اگر عاصی کچھ دیر اور زندہ رہتا تو وہ یقیناً کشمیری مزدوروں میں انقلاب بپا کرتا''۔

عاصی کے یہ چند اشعار کشمیری قوم کو اس انقلاب کا پیغام دیتے ہیں جس کی بدولت تغیرات زمانہ کے وہ خدوخال نظر آسکتے ہیں جو زمانے کی نظروں سے صدیوں تک اوجھل رہے :

انقلابکہِ نعرہ ستیِن شال زن ظالم ژلن
لال نیرن عاصیا ئنٔر سورہنہ بالن پلن
یاد تھوونی میانی کتھ آخر کرُن ژیٔی راج چھُے
وقت آو نزدیک بالکل دین کلس ژیٔی تاج چھُے
ہا مزورو یتھنہ کھوژکھ گگراین وزِملن
چانہِ شمشیرِ سیتۍ دریاو رخ پھرن جنگل الن

(نعرہ انقلاب سے ظالم گیدڑوں کی طرح بھاگ جائیں گے اور اے عاصی! چٹان پانی کی طرح بہہ جائیں گے اور ان میں مخفی لعل وجواہر ظاہر ہو جائیں گے۔ یاد رکھ کہ آخر تو ہی راج کرے گا اور اے کشمیری مزدور! اب وقت آچکا ہے کہ تاج ترے سر پر ہوگا۔ تو بجلیوں اور برق وباراں سے نہ ڈر کہ تیری ہمت دریاؤں کا رُخ موڑ کر رکھ دے گی۔)

عاصی نے فارسی میں بھی شاعری کی ہے لیکن اس کا کلام زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ کشمیر کے مزدوروں اور محنت کشوں کا ترجمان یہ شاعر 1947ء کے فوراً بعد انتقال کر گیا۔

رحمان راہی نے اپنا پہلا مجموعہ کلام ''نوروزِصبا'' جو 1958ء میں شائع ہوا، کشمیر کی تحریکِ آزادی کے نام معنون کیا۔ اس مجموعے میں چند ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن سے شاعر کے ان خیالات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے جو اس کے دل میں کشمیر کی آزادی کے لئے موجزن تھے۔ گلستانِ سعدی سے ماخوذ ایک حکایت جسے راہی نے ''اس زمانے میں'' کے عنوان سے کشیری نظم میں ڈھالا ہے، ہمعصر کشمیر میں سرکاری پکڑ دھکڑ کے لامتناہی سلسلے پر ایک زبردست طنز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''آج کی بات'' اور ''اگر ہوش سنبھالے'' جیسی

نظموں میں بھی آزادیِ کشمیر کی چاہت کا بیان واضح ہو جاتا ہے جو شاعر کی شعوری کوشش کا ماحصل ہے۔

تنہا انصاری مرحوم نے اپنی منظومات ''کشمیریوں کا ترانہ'' اور ''شہر آشوب'' میں بھی اہلِ کشمیر کی پسماندگی، استحصال اور سیاسی غیر یقینیت کا رونا رویا ہے۔

یہ مصنف ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں تقریباً دو سال تک سرینگر کے سنٹرل جیل میں 1958 اور 1959ء کے دوران مقید رہا۔ زندان کے جان لیوا اور سر بمہر ماحول میں بے رنگ شب و روز گذارنے کے دوران میں نے کئی ایسی منظومات تخلیق کیں جو ایک پابہ جولاں انسان کے دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی آزادی کی فطری خواہش کا اظہار ہوتی ہیں۔ اِس تعلق میں ''شمع اور شاعر''، ''شہید کو سلام'' اور ''زنداں نامہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں جو میرے کشمیری زنداں نامہ ''زنجورهِ ہُند ساز'' (سازِ زنجیر) میں شامل ہیں۔ جو 1963ء میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

میرے مجموعہ کلام ''الہام'' میں بھی اسی قبیل کی کئی اور نظمیں مثلاً ''یہ میرا وطن''، ''نغمہ وطن'' اور ''ایک ملک ایک مسافر'' وغیرہ شامل ہیں۔

غلام نبی عارض (1916-1965ء) نے بھی کشمیری شاعری میں اپنی وطن پرستی اور آزادی پسندی کے گیتوں اور ترانوں کا اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو لکھتے ہیں کہ ''عارض مرحوم عبدالاحد آزاد کا بھانجا بھی تھا اور شاعری میں اس نے آزاد سے بہت حد تک فکری اور ذہنی تربیت حاصل کی تھی۔ عارض نے جہاں اپنی شاعری میں مذہب و عشق کو خصوصی موضوعات کے طور پر ورطہ تحریر میں لایا ہے وہاں اس کے دل سے بھی آزادی کے متوالوں کی طرح ایک روشن مستقبل کے لئے آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ عارض کی بلوغت کے دور میں بھی کشمیر میں غلامی کا زمانہ تھا اور انسانی زندگی پر اس بدترین پابندی کے خلاف اس نے اپنی کئی نظموں میں غلامی سے سوکھے اور ویران کھیتوں کے لئے آزادی کی حیات بخش بارش کی تمنا کی ہے لیکن عارض کے اس نوع کے کلام میں نعرہ بازی اور سطحیت کا عنصر

غالب نظر آتا ہے''۔(12)

کشمیری زبان میں سیاسی اور انقلابی شاعری کی جن بنیادوں کو مہجور اور آزاد نے مستحکم کیا تھا، 1947ء کے بعد اگرچہ ان پر کوئی نئی عمارت تعمیر نہ ہو سکی لیکن کشمیری زبان کے مخلص، قوم پرست اور آزادی پسند شاعر دبے دبے لہجے اور استعاروں اور کنایوں میں سیاسی بے راہ روی اور آزادی کے نام پر عوام کے استحصال کے خلاف برابر اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ اس تعلق میں بدقسمتی کا یہ پہلو بھی اُبھر کر سامنے آجاتا ہے کہ گنتی بھر کے چند شاعروں نے وقتی مفادات کے حصول کے لئے جن حاکمانِ وقت کے درباروں کی دہلیز پر سجدے کئے ان کی اقتدار سے محرومی کے ساتھ ہی یہ سخن گو پرانی حکومت کی شدید نکتہ چینی اور نئے اربابِ اختیار کی قصیدہ خوانی میں بھی پیش پیش رہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر جھوٹ کو سچ اور ہر صداقت کو باطل ثابت کرنے کی غرض سے ضمیر اور اظہار کے خلوص اور سر بلندی کو خود ہی پامال کیا۔ لیکن جہاں ایک پوری قوم اور اس کی کئی نسلیں استبداد اور استحصال کے خلاف قدم قدم پر بغاوت کے لئے آمادہ ہوں وہاں ایسے چند قلمکاروں کی ضمیر فروشی اور خود غرضی کے نشاں کاروانِ حریت کے قدموں تلے گردِ راہ کے ناچیز ذرّوں کی طرح خود ہی مٹ جاتے ہیں۔



حوالہ جات

(1)- کشمیر میں سامراجی سازش، غلام محمد راجپوری اور منوہر ناتھ کول، سماجی اور سیاسی تعلیمی حلقہ سرینگر 1954ء۔

(2)- اس نام نہاد مقدمے میں راقم بھی دو سال تک سرینگر کی سنٹرل جیل میں نظر بند رہا۔

(3)- کلیات مہجور، کلچرل اکادمی، سرینگر؛ 1983ء ص 266 تا 447۔

(4)- ایضاً ص 77۔

(5)- شیرازہ سرینگر (مہجور نمبر)، کلچرل اکادمی سرینگر۔ اگست 1984، ص 101-100۔

(6)- پندرھویں صدی عیسوی کا مشہور فرمان روائے کشمیر جس کے دور میں ملکِ کشمیر میں ادب، فن، علم اور ثقافت کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔

(7)- عہد عالمگیری کا ایک مشہور فارسی شاعر، جو سرینگر کے محلے راجوری کدل میں رہتا تھا۔

(8)- حضرت شیخ یعقوب صرفی گنائی، ملکِ کشمیر کے ممتاز فارسی، عالم، فاضل اور مصنف جو مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں گذرے ہیں۔ ان کا مقبرہ سرینگر کے زینہ کدل کے علاقے میں ایشاں صاحب کے نام سے آج بھی معتقدین کے لئے فیض اور سکون کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

(9)- شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر۔

(10)- ترجمہ، غلام نبی خیالؔ

(11)- کلیات آزاد، مرتبہ ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو، کلچرل اکادمی سرینگر، 1967ء، ص 78-77

(12)- ایضاً



کشمیری ادب پر روسی ادب کے اثرات

کشمیری ادیبوں ، شاعروں اور قلمکاروں نے سوویت یونین کے ادب کا سنجیدہ مطالعہ اُس وقت اپنے محبوب مشاغل میں شامل کرلیا جب بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہندوستان کی ترقی پسند ادب کی تحریک سے متاثر ہوکر کشمیر میں بھی اسی طرح کی ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی گئی ۔اس تنظیم نے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست اور معرکتہ الاراء ثقافتی تحریک کی شکل اختیار کی ۔کشمیر کے اُس دور کے نمایاں شاعر اور قلمکار مثلاً غلام احمد مہجور کشمیری، عبدالستار عاصی ،غلام نبی عارض، عبدالستار نجور، مرزا غلام حسن بیگ عارف ، دینا ناتھ نادم، امین کامل، غلام نبی فراق ، نور محمد روشن، رحمان راہیؔ ، نندلال امبار دار، شیام لال در بہار، دینا ناتھ المست، امر چند ولی، عزیز ہارون، سوم ناتھ زتشی، عبدالمجید سائر، غلام احمد ناز اور عبدالرحمان راحت اس تحریک کے قافلہ سالار بن گئے اور اس کاروان کے دیگر رہروؤں میں اختر محی الدین ، بنسی نردوش ، حبیب کامران ، اکبر لداخی ، تاج بیگم رینزو ، امیش کول ، پریم ناتھ پریمی، ارجن دیو مجبور، تیج بہادر بھان، شرید رینہ زار، موتی لال ساقی ،محمد عبداللہ عارج، تریلوکی ناتھ کندن ، دیپک کول، چمن لال چمن ، مکھن لال بیکس ، فاروق بڈگامی، مظفر عازم اور غلام نبی خیال شامل تھے۔

چونکہ اس تنظیم کے نظریاتی پس منظر میں انقلابِ روس، مزدور کی محنت اور عام انسان کی اقتصادی بدحالی کے کوائف جلوہ گر تھے لہٰذا کشمیری ادیبوں نے سب سے پہلے روسی ادب کے مطالعہ کو ایک مذہبی فریضے کی طرح سرانجام دینے کا سلسلہ شروع کیا اور روسی ادیبوں ٹالسٹائی ،شولوخوف، گورکی ، ترگنیف ، چیخوف ، پشکن ، گوگول اور مایا کووسکی کی تخلیقات نے مقامی طور پر مقدس کتابوں کا درجہ حاصل کرلیا۔

کشمیر میں روس نواز ترقی پسند ادبی تحریک کو 1950ء کے موسم بہار میں کشمیر کلچرل کانگریس کا نام دیا گیا اور پھر اُس دور کے سوویت یونین کے ادب خاص کر روسی ناول نے کشمیر کے ادباء کے فکر و ذہن کو اس حد تک مسحور و مخمور کر لیا کہ ان کی نگارشات میں روسی انقلاب کے قائدین خاص کر لینن اور ادبائے روس کے تخیل کی جلوہ سامانیاں ہر طرح سے سرایت کرنے لگیں۔

کشمیر کے ترقی پسند مارکسی ادیبوں میں کئی سرکردہ سخن ور پہلے پہل اردو میں شاعری کرتے تھے جن میں دینا ناتھ نادم، محمد امین کامل اور عبدالرحمان راہی قابل ذکر ہیں لیکن اُن کی اُس زمانے کی شاعری روس، سرخ ستارہ، سرخ انقلاب اور مارکسی اشتراکیت کی مدح سرائی کرتے کرتے فنکارانہ نزاکت اور شاعرانہ نفاست کی سطح سے بہت نیچے گر جاتی تھی اور یہ شعراء اپنی شاعری کو عامیانہ نعرہ بازی کا رنگ دے کر روس نواز ہونے کے دعویٰ دار بنے بیٹھے تھے۔ اس بے راہ روی اور اندھی تقلید نے ترقی پسندی کے حوالے سے مقامی طور پر کئی ایسی شعری اور نثری تخلیقات تو جنم دیا جنہیں بعد میں یہ ادیب اور شاعر اپنے مجموعوں میں شامل کرنے سے خود ہی اِحتراز کرتے رہے اور اس طرح سے یہ تنگ بندی ہمارے شاندار ترقی پسند ادب کے سنہری دور کا ایک سیاہ باب بن کے رہ گئی۔

دینا ناتھ نادم نے ایک جگہ سرخ رنگ کی ترنگ میں یہ اشعار تخلیق کئے:

تقدیر کے وعدوں پر بھلا تکیہ کہاں تک؟
عزم و عمل سے قسمتِ انساں کو بدل دو
اک انقلاب سے ہیں پھر وابستہ اُمیدیں
ایماں اگر مانع ہے تو ایماں کو بدل دو
بھڑکا نہ سکے آگ جو تڑپا نہ سکے خون
اُس شاعرِ بے شرم بے ایماں کو بدل دو

اور امین کاملؔ نے اس قسم کے اشعار موزوں کئے:

دیکھ تو پردیسی! ٹرومین کس کو دیتا ہے یہ دھمکی
ایٹم بم کی
کیا ہم جنگی بھوتوں کے آگے جیتے جی جھک جائیں گے؟
آزادی کے رستے پر ہم کیا چلنے سے رُک جائیں گے؟
ہم ہیں کرانتی کے رکھوالے
ہل اور درانتی کے رکھوالے
جگ کی شانتی کے رکھوالے
ہم سب کی للکار یہی ہے
ہم سب کا آدھار یہی ہے

نادؔم نے اپنی نظم ''کچھ عرصہ پہلے'' میں لینؔن کی اس طرح تعریف کی:

زمینہِ لالہ زاراہ بُنتھ ہیوّت پھولُن
یوہوے پختہ کاراہ چھُ دِلبر لینؔن
(زمین لالہ زار بن کے کھلنے لگی اور اسی پختہ فکر دلبر کا نام لینؔن ہے)

اس نام نہاد لینؔن نواز تنگ بندی کی حد اُس وقت ہوئی جب ایک عمومی معیار کے شاعر نندلال امبار دارنہؔ نے لینؔن ہی کے بارے میں فرمایا:

لینن وُچھ میہ خابس اندر ڈول وایان
(میں نے خواب میں لینؔن کو ڈھول بجاتے دیکھا)

تاہم اس خرافاتی شاعری کے باوجود روسی ادب کے کئی معیاری فن پارے کشمیری زبان میں منتقل ہوئے جن میں گورکی، چیخوف، ٹالسٹائی اور گوگول وغیرہ شامل ہیں اور اس ترجمہ کاری نے کشمیری زبان وادب کی جہتوں کو ایک وسعت اور کشادگی عطا کی۔

اُس وقت وسط ایشیائی ریاستوں بشمول ازبکستان، تاجکستان اور قزاقستان بھی سوویت یونین ہی کا حصہ تھیں اور وہاں تخلیق کردہ ادب بھی کشمیری فکر وذہن کو متاثر کرتا رہا۔

وسط ایشیاء کے ساتھ کشمیر کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ سینکڑوں سال قبل جب کشمیر ایک خودمختار ملک تھا تو اسی وقت وسط ایشیاء کے ساتھ اس کے تجارتی، ثقافتی اور ادبی لین دین کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

سلطان سکندر بت شکن (1389-1413ء) کے دور میں وسط ایشیاء سے کئی سربرآوردہ اکابرین دین، علماء اور فضلاء کشمیر آئے جن میں سرفہرست حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کا نام نامی آتا ہے۔ انہوں نے کشمیر میں وارد ہو کر یہاں ہندومت کے طبقاتی رسوم اور رواج اور ذات پات کی بندشوں میں بندھے ہوئے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور کشمیریوں نے ذوق وشوق اور اپنی رضامندی کے ساتھ انسانی مساوات کے ترجمان اس آفاقی دین کو اپنا مذہب تسلیم کرلیا۔

حضرت امیر کبیرؒ کے ہمراہ جلال الدینؒ اور بابا حاجی ادہم صاحبؒ بھی کشمیر آکر یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ سرزمین کشمیر کے مایہ ناز فارسی شاعر مُلّا غنی کشمیری کے اجداد بھی حضرت امیر کبیر کی ہمراہی میں بخارا سے کشمیر آئے تھے۔

سلطان سکندر کے بیٹے سلطان زین العابدین بڈشاہ (1420-1470ء) نے جو خود بھی علم وادب، موسیقی اور فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا، وسط ایشیاء سے خاص طور پر علماء اور اساتذہ کو طلب کروایا اور انہیں کشمیر میں ممتاز عہدوں پر فائز کیا۔ ان عالموں اور اہل فکر کے زیر اثر مقامی زبان اور تہذیب کے ارتقائی عمل کی بدولت کشمیری زبان وسط ایشیاء کی زبانوں بالخصوص فارسی اور ازبیک کے قریب آگئی۔ اس قربت کے آثار آج بھی ہماری زبان میں باقی ہیں۔ جہاں صوتیات کے لحاظ سے کشمیری اور فارسی میں بہت حد تک ہم آہنگی نظر آتی ہے وہاں چند ازبیک الفاظ مثلاً سماوار، طشت، کلچہ، زری جامہ وغیرہ بھی ہماری زبان میں داخل ہو چکے ہیں۔ وسط ایشیاء سے عالموں اور شاعروں اور سخن دانوں کے علاوہ جو کاری گر اور صناع کشمیر لائے گئے وہ کام کاج کے وقت اپنی مقامی زبان میں عوامی طرز کے گیت گایا کرتے تھے۔ اہل کشمیر نے اس موسیقی کو پسند کرلیا اور یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی

موسیقی آج وسط ایشائی موسیقی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

ادب اور شاعری کے میدان میں بھی وسط ایشیاء اور اس کے ادب نے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کیا ہے اور اثر پذیری کا یہ سلسلہ خاص کر 1947ء کے بعد اور بھی وضاحت کے ساتھ نمایاں ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے ادبی حلقوں میں آج شرف رشید دف، مرزا ترسون زادہ اور علی شیر نوائی خاصے جانے پہچانے نام ہیں۔

کشمیر کے قومی شاعر مہجورؔ کے یہاں سے روسی ادب کے کشمیری ادب پر تاثرات کا آغاز ہوتا ہے۔ مہجورؔ کا جو بھی کلام 1947ء سے قبل یا اُس کے بعد کشمیر کے سیاسی ماحول کی عکاسی کرتا ہے اُس میں کشمیر پر ڈوگرہ حاکموں کے ظلم وستم اور آزادی کے بعد نام نہاد رہبروں کی عوام دشمنی کے افسانے بھی واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

مہجورؔ کے ہمعصر عبدالاحد آزادؔ نے مارکسی ادب کا اس حد تک اپنی شاعری پر گہرا اثر قبول کیا تھا کہ اس نے کارل مارکس پر نظمیں تحریر کیں۔ اپنی چند منظومات کو مارکسزم، سرمایہ داری اور انقلابِ روس کے عنوانات دینے کے علاوہ اس نے اپنی کئی تخلیقات میں روس کے اس انقلاب کی مدح سرائی کی ہے جو اکتوبر 1917ء میں وہاں آیا۔ آزاد ہی کی طویل نظم ''دریا'' بھی انہی جذبات اور خیالات کے سلسلے سے منسلک ہے جو کسی شاعر کے دل ودماغ میں غریبوں اور مزدروں اور محنت کشوں کی ہمدردی اور استحصالی قوتوں کی ملامت کے لئے وقتاً فوقتاً اُبھرتے رہتے ہیں۔

1947ء کے قبل ریاست جموں وکشمیر میں جس تیز گامی کے ساتھ تحریک آزادئ کشمیر آگے بڑھ رہی تھی اس نے یہاں کے ترقی پسند ادیبوں کے فکرِ وفن میں انقلابی خیالات کو بھی جلا بخشی اور کشمیری ادیب اور قلم کار اپنے آپ کو قلمی طور پر اس انقلابی تغیر سے ہم آہنگ کرنے کی اس دوڑ میں خاص پہل کرتے رہے۔ اُس وقت سوویت یونین کے 1917ء کے انقلاب نے ساری دنیا میں مغربی سامراج اور استحصالی قوتوں کے خلاف عوامی طاقت کو نئی زندگی بخشی تھی اور ہندوستان کے باشعور اور روشن دماغ تخلیقی ذہن بھی

اپنی تصوراتی اور نظریاتی رہنمائی کے لئے روس کی طرف اُمید کی نگاہیں لگا رہے تھے۔

اُس دور میں روس نے ادب کے میدان میں دنیا کے تناظر میں عظیم ادب کو منظر عام پر لایا اور کشمیری ادیبوں نے بھی مقدس صحائف کی طرح ان تخلیقات خاص کر روسی افسانے اور ناول کا مطالعہ اپنا بہترین مشغلہ بنالیا چنانچہ کشمیر کے ادیبوں کا ان شاہکاروں سے براہ راست متاثر ہونا ایک فطری ردعمل کے طور پر سامنے آیا اور اس طرح سے 1950ء سے لے کر تقریباً بیس برس تک کشمیری زبان میں روسی کلاسیکی اور جدید ادب منتقل ہوتا رہا۔

کشمیر میں سیاسی حالات کی ڈرامائی تبدیلیوں اور اس سیاسی طور متنازعہ خطے کے حوالے سے روس نے برملا طور پر ہندوستانی موقف کی حمایت کی جبکہ مغربی قوتیں اور خاص کر امریکہ اس معاملے پر ایک مختلف رائے ظاہر کرتا رہا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے کشمیر کے ترقی پسند ادیب بھی رفتہ رفتہ روس نوازی کے ایک تاریخ ساز سلسلے کی کڑیاں توڑ کر مقامی سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے کی طرف متوجہ ہوئے اور 1975ء کے بعد بالخصوص سیاسیاتِ کشمیر نے جو ایک غیر متوقعہ پلٹا کھالیا اس نے مقامی ادیبوں کو کسی حد تک ایک فکری تذبذب کا بھی شکار بنادیا۔

اس طرح سے کشمیر کا ترقی پسند ادیب روسی ادب کی پرستش کی دائرے سے باہر کر مغربی اور مشرقی ادب کے دوسرے مالا مال خزانوں کی خوشہ چینی کرنے لگا اور اس نئی تبدیلی کے نتیجے کے طور پر روسی ادب کے تراجم کو محافظ خانوں میں تعظیم اور تکریم کے ساتھ محفوظ کر کے ادبائے کشمیر حافظ۔ اقبال۔ شیکسپیئر۔ عمر خیام اور غالبؔ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں کے ممتاز قلمکاروں کی تخلیقات کو اپنی مادری زبان میں منتقل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کام میں ساہتیہ اکادمی نے ریاستی ادیبوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی اور حمایت کی۔

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ جس والہانہ پن کے ساتھ چند سال تک روسی ادب کے شاہکار یکے بعد دیگرے مسلسل طور پر کشمیری میں منتقل کئے گئے وہ سلسلہ اس کے بعد منقطع ہوگیا اور اس کے بعد معدودے چند تراجم کے سوا، جن میں غلام نبی خیال کا رباعیات عمر خیاؔم کا کشمیری ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، کشمیری میں کوئی ایسا ترجمہ

کتابی صورت میں ظہور پذیر نہیں ہوا جس سے عامیانہ اور بے جان قسم کی سعی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عمر خیام کا ترجمہ کرنے والوں میں اگرچہ مرزا عارف اور کوئی عبدالاحد جان بھی شامل تھے لیکن ان کی اس کاوش کو بے جان تک بندی اور تضیع اوقات کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

آج صورتحال یہ ہے کہ ریاست کے ادبی حلقوں میں روسی ادب کے تراجم کتابوں کی شکل میں الماریوں میں گرد آلود ہو رہے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا گیا ان کی جگہ غالب، اقبال، ٹیگور، حافظ، شیکسپیئر اور دیگر مشرقی مصنفین، شعراء اور ادباء لے چکے ہیں۔

اس سے زیادہ مایوس کن بات یہ ہے کہ گزشتہ چند برس سے کشمیری میں دیگر زبانوں کے ادب پاروں کا ترجمہ کرنے کا سلسلہ بہت حد تک ناپید ہو کے رہ گیا ہے۔

جہاں تک کشمیری زبان میں ترقی پسند تحریک کے پرچم تلے روسی ادب سے کشمیر کے استفادہ کا تعلق ہے تو اس ضمن میں رحمان راہی کی نظم ''امن کا دستخط''، دینا ناتھ نادم کی ''امید فردا''، ناجی منور کی ''امن کی دو فاختائیں''، غلام نبی خیال کی ''زندگی اور موت'' اور مایا کودسکی کی ایک نظم کا ترجمہ، علی محمد لون کا ڈراما ''دیوانے کا خواب'' اور عبدالستار عاصی، عبدالستار رنجور، نور محمد روشن، حبیب کامران، ارجن دیو مجبور اور عزیز ہارون کی تخلیقات مقامی طور پر ترقی پسند ادب کی بنیادوں کو مضبوطی بخشنے کا ذریعہ ثابت ہوئی ہیں۔ راہی نے اسی دوران ازبکستان، تاجکستان اور قزاقستان پر اپنے تعارفی مضامین لکھ کر کشمیر کے قاری کو وسط ایشیاء کی ان ریاستوں کے ماضی و حال سے متعارف کیا۔ نادم کا مشہور کشمیری اوپیرا 'بھنورا اور نرگس' جب کشمیر میں سٹیج ہو کر ہر حلقے میں سراہا گیا تو تاجک زبان کے سرکردہ شاعر اور ادیب مرزا ترسون زادہ نے اسے اپنی زبان کا جامہ پہنایا۔ 'بھنورے اور نرگس' کی کہانی پر مبنی داستان کو شرف رشیدوف نے بھی ''نغمہ کشمیر'' کے نام سے ازبیک زبان میں تاشقند میں شائع کروایا۔ اس کشمیری کہانی کے بارے میں رشیدوف لکھتا ہے ''ہم کشمیر کے دریائے جہلم کی سیر کر رہے تھے اور وہیں پر ہم نے ''یمبر زل (نرگس) اور بومبر (بھنورا) کی

کہانی سنی جسے ہماری ساتھی گا گا کر سنا رہے تھے''۔(1)

روس میں نغمہ کشمیر پر مبنی جو بیلے (Ballet) تیار کیا گیا اس کے موسیقار الغ بیگ موسیف نے ''سوویت دیس'' رسالے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''شاعر نے اس نظم کے لئے ایک قدیم داستان سے فیضان حاصل کیا تھا اور نظم میں وہاں کی ثقافت کی روح سمونے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس خصوصیت کی وجہ سے میرے ذہن میں رشیدوف کی نظم کی بنیاد پر بیلے تیار کرنے کا خیال آیا''۔

وسط ایشیاء کا قدیم علاقہ عام طور پر کشمیریوں کے ذہن میں کسی افسانوی اور طلسماتی سرزمین کا نقشہ پیش کرتا آیا ہے۔ وہ اپنے خیال میں اب بھی یہی باور کر لیتا ہے کہ اسی علاقے میں واقع کوہ قاف کے پیچھے پریاں رہتی ہیں جو اگر چین کے کسی شہزادے کو دیکھتی ہیں تو اسے اپنے سحر کے زور سے قابو میں لاتی ہیں اور بعد میں اسے بے جان پتھر میں تبدیل کر لیتی ہیں۔ مشرق کی اکثر الف لیلوی داستانوں میں یہ علاقہ دیوتاؤں اور جنات کا مسکن بتایا گیا ہے۔ اس قسم کی داستانوں کے عاشق خاص کر کشمیری دیہاتوں میں رہنے والے لاکھوں دہقان آج بھی جاڑے کی یخ بستہ راتوں میں ''شاہنامہ فردوسی''، ''داستان امیر حمزہ'' اور ''سکندر نامہ'' میں وسط ایشیاء کے پہاڑوں، وادیوں اور چراگاہوں میں رہنے والے مافوق الفطرت کرداروں کے افسانے پڑھ پڑھ کے اپنی جسمانی حرارت کو قائم رکھتے ہیں۔

وارث کرمانی تاجکستان کے بارے میں کہتا ہے۔ ''یہی وہ علاقہ ہے جو دیکھنے کی غرض سے میں ہمیشہ بے قرار رہتا تھا۔ جس کی رومان انگیز داستانیں اور شاعری میں نے بھی پڑھی تھی۔ درۂ خیبر سے اس پار آنے والے قافلے ہرات سے بخارا تک وہ سلسلۂ کوہ جس کی گود میں عجمی تہذیب نے اپنی آنکھیں کھولیں اور جہاں سامانی، غزنوی اور سلجوقی بادشاہ رومان، معشوق اور شراب کی مدہوش کن محفلیں آراستہ کر کے دادِ عیش دیا کرتے تھے۔ اسی سرزمین میں رودکی، فردوسی اور جامی نے اپنے لازوال نغمے گائے ہیں۔ یہ بید مشک کا

درخت گویا کوئی دوشیزہ اپنے گیسو پریشان کر کے کھڑی دیکھ رہی ہے۔غالباً درخت کے نیچے ظہیر الدین بابر صحرانوردی کرتے کرتے ستایا ہوگا''۔(2)

اسی طرح ازبکستان تہذیب وتمدن کا ایک قدیم اور مشہور مرکز ہے جہاں سے اعلیٰ پایہ کے نجومی، ریاضی دان اور فلسفہ دان اٹھے ہیں۔ان میں سے کشمیر کے لوگ گیارہویں صدی کے ریاضی دان، منجم اور فلسفی احمد الغرغانی کے علاوہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی ابوریحان البیرونی، بوعلی سینا اور نظام الدین علی شیر نوائی کے ناموں سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔ اسی علاقے میں سمرقند و بخارا کے وہ مشہور تاریخی شہر ہیں جن میں سے حافظ شیرازی نے ایک کا ذکر کر کے اس کا شعری تقابل کشمیر ہی کے ساتھ اس مصرے میں کیا ہے :

سیہ چشمانِ کشمیری وترکانِ سمرقندی

روسی ادب کے شہکاروں کے مطالعہ نے کشمیر کے ہمعصر شاعروں اور ادیبوں کو اس طرح تحریک بخشی کہ ان میں کئی فن پارے آج کشمیری زبان میں ترجمہ کی شکل میں موجود ہیں۔مظفر عازم نے چار جلدوں میں ٹالسٹائے کی ضخیم ناول ''جنگ اور امن''، علی محمد لون نے گورکی کی ''ماں''، سوم ناتھ زتشی نے نکولائی گوگول کی ''انسپکٹر جنرل'' اور رتن لال شانت نے چیخوف کی ''تین بہنیں اور ریچھ'' کشمیری میں منتقل کی ہیں۔

اختر محی الدین، جو کشمیر کے ایک ممتاز افسانہ نگار تھے، 1968ء میں روس کے دورے پر گئے تو وہاں سے واپسی پر انہوں نے ''سلاوامیر'' کے نام سے ایک سفرنامہ تحریر کیا جو روسی طرزِ معاشرت کے چند پہلوؤں کے ساتھ مصنف کے اختلافات کی وجہ سے بھی خاصی دلچسپی کا حامل ہے۔

جہاں روسی ادب کے چیدہ چیدہ ناولوں، ڈراموں یا کہانیوں کو کشمیری میں منتقل کرنے کا سلسلہ کم وبیش تین دہائیوں تک جاری رہا وہاں روس یا وسط ایشیائی ادب کے بارے میں کشمیری میں کوئی تحقیقی یا تعارفی کام نہیں ہوا ہے۔اس سلسلے میں راقم نے سب سے پہلے مشہور شاعر پشکن پر ایک تنقیدی مقالہ لکھا جو میری ساہتیہ اکادمی کی انعام یافتہ

کتاب ''گاشرِ منار'' (روشنی کے مینار) میں شامل ہے۔ یہ مضمون روس کے اس عظیم ترین شاعر پر اِس قسم کا پہلا مضمون تھا جو بعد میں ریاست کے کئی رسائل وجرائد میں بار بار چھپتا رہا۔



حوالہ جات

(1)- سانگ آف کشمیر، شرف رشیدوف، غفور غلام لٹریچر اینڈ آرٹ پبلشرز، تاشقند، 1983ء ص 79

(2)- روس کا سفر، سہ ماہی گفتگو، مرتبہ: سردار جعفری، بمبئی؛ 1976ء، ص145

جموں و کشمیر میں اُردو صحافت ایک نظر میں

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو صحافت کا آغاز دراصل گزشتہ صدی کے تیسری اور چوتھی دہائی میں ایک لازمی ردعمل کے طور پر اُس وقت ہوا جب ہندوستان کے بہت بڑے ثقافتی مرکز لاہور سے کئی روزنامے اُردو دان دنیا میں اپنی دھاک بٹھا رہے تھے اوران کے تشہیری عمل میں کشمیر میں شخصی راج کے خلاف عوامی تحریک کی مقبولیت کی حمایت کرنا ایک بنیادی مقصد تھا۔

کشمیر کے اہل دانش و بینش اور کشمیری عوام کے باشعور نمائندوں نے اس کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ جہاں پنجاب کے اخبارات ان کے جذبات کی ترجمانی کرنے میں لگے ہیں وہاں مقامی طور پر کوئی ایسا اخبار یا جریدہ موجود نہیں ہے جو ان محسوسات کے اظہار کی بازگشت بن سکے۔ جموں کے چند گِنے چُنے اخبارات تو ڈوگرہ راج کے حامی اور حواری تھے لہٰذا انہوں نے کشمیر کی عوامی تحریک کی نہ صرف یہ کہ حمایت نہیں کی بلکہ وہ اسے غنڈہ گردی سے موسوم کرنے سے بھی باز نہیں رہے۔

لاہور میں اُس وقت اُردو دُنیا میں ادب اور صحافت کے روشنی کے مینار مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، محمد دین فوق، چراغ حسن حسرت اور شورش کشمیری تحریکِ حریتِ کشمیر کے علمبردار تھے جو اپنے اخبارات زمیندار، انقلاب، سیاست، کشمیری میگزین اور چٹان کے صفحات پر برصغیر کی تحریک آزادی کے حق میں پر جوش اور بااثر مضامین، مقالات اور منظومات سے ہر ایک کا فکر و ذہن گرما رہے تھے۔ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ظفر علی خان نے لکھا :

کشمیر میں اسلام کا ہر عقدہ ہوا ہے
برطانیہ کی زلفِ گیرہ گیر سے پیدا
سن لو گے کسی دن یہ شہیدوں کی زباں سے
آزادیٔ دِلّی ہوئی کشمیر سے پیدا

اوران ہی کی نظم ہنگامۂ کشمیر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

ہرطرف ہنگامہ پھر برپا ہے دار و گیر کا
ہو رہا ہے پھر ہرا زخم کہن کشمیر کا
بادشاہ بے مہر ہے اور بے نیاز اُس کا وزیر
شکوہ کس سے کیجئے پھوٹی ہوئی تقدیر کا
ایک لے دے کے خدا باقی ہے جس کے عرش پر
حق ہے کچھ کشمیریوں کے نالۂ شب گیر کا

اہلِ کشمیر کی زبوں حالی اور بے بسی کے حوالے سے علامہ اقبال کی درجنوں منظومات کو یہاں پر نقل کرنا اس لئے بھی ضروری نہیں کہ یہ نظمیں سارے کشمیر میں تقریباً زبانِ زد خاص عام ہو چکی ہیں۔

حفیظؔ جالندھری کا جولائی 1931ء کے کشمیری شہیدوں کو خراج ''خون کے چراغ'' اور ''تصویر کشمیر'' اور محمد دین فوقؔ کی ''شورش کشمیر'' اور ''پیشین گوئی'' اسی والہانہ اظہار کا ایک تسلسل ہے۔

حفیظؔ کی طویل نظم ''تصویر کشمیر'' سے صرف ایک بند یہاں پیش کرتا ہوں:

وادی وکہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی
نخلِ آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی
اس قدر خوش رنگ کلیاں اور مرجھائی ہوئی
راکھ میں چنگاریاں ہوں جیسے کجلائی ہوئی

حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جواں وپیر کا
ایک پہلو یہ بھی کشمیر کی تصویر کا

ہندوستان کی تقسیم کے وقت جو اخبارات کشمیر سے شائع ہوتے تھے ان میں روزنامہ ''ہمدرد''، ''خدمت''، ''مارتنڈ'' ہفت روزہ ''ملت'' اور ''اصلاح'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے مقتدر صحافیوں میں مولانا محمد سعید مسعودی، میر غلام احمد کشفی، میر عبدالعزیز، کشیپ بندھو، جانکی ناتھ زتشی وغیرہ شامل تھے۔

اخبار ''ہمدرد'' کی اشاعت کے بارے میں پریم ناتھ بزار لکھتے ہیں۔ ''میں نے اور شیخ محمد عبداللہ نے 1935ء میں کشمیر کی سیاسیات کو غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت محسوس کی اور یکم اگست کو ہم نے مشترکہ طور پر ہمدرد کے نام سے ایک اُردو ہفت روزہ جاری کیا۔ اس جریدے کے اوّلین شمارے کی رسم اجراء ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے ہاتھوں سرینگر کے حضوری باغ میں ایک عوامی اجتماع میں انجام دی گئی''۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اُس وقت کشمیر کے حلقہ قارئین کے ذہنوں پر مقامی اخبارات کے اداریوں اور رشحات کا اچھا خاصا اثر رہا ہوگا۔ غالباً اسی لئے بزاز نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ''ہمدرد'' جمہوریت اور بلالحاظ مذہب وملت کشمیریوں کا علمبردار تھا۔ اس کے صفحات پر اکثر وبیشتر رجعت پسندانہ عقائد کے خلاف تلخ اور حقیقت پر مبنی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں دوسرے سبھی اخبارات صرف مسلم یا ہندو نقطہ نظر پیش کرتے تھے ''ہمدرد'' تن تنہا ایک مکتب کی طرف قائم رہا اور اس کی سنجیدہ، خیال انگیز اور بااثر تحریروں کا نتیجہ تھا کہ مسلم کانفرنس کو 1939ء میں نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا۔

1946ء میں پریم ناتھ بزاز کشمیر چھوڑ دو تحریک کی مخالفت میں کھل کر سامنے آگئے کیونکہ اُس وقت وہ مبینہ طور پر مہاراجہ ہری سنگھ اور پاکستان نواز حلقوں کے زیر اثر کام کر رہے تھے۔

اسی پس منظر میں ''ہمدرد'' میں کشمیر چھوڑ دو تحریک کو طنزیہ انداز میں ہدفِ تضحیک بنایا

گیا۔ اس قسم کی طنزیہ نظمیں اس اخبار میں مبینہ طور پر عبدالاحد آزاد اور میر عبدالعزیز لکھا کرتے تھے جن میں وہ نمک پاش، مرچ پاش اور زہر پاش جیسے فرضی نام استعمال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ڈوگرہ شاہی کے خلاف کشمیر چھوڑ دو تحریک کشمیر کے ہر غلام مرد وزن کے دلوں کی دھڑکن بن کر سامنے آئی تھی۔

بزاز کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ 1947ء سے قبل ریاستی اخباروں پر بھی پابندیاں عائد کی جاتی تھیں اور ان کی خلاف ورزی کے نتیجے میں صحافیوں کو سزائیں بھی سنائی جاتی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں ''مہاراجہ ہری سنگھ کی جمہور کش پالیسیاں اگست 1947ء کے وسط میں پوری طرح واضح ہوگئیں جب یہاں انسانی حقوق پر شب خون مارا گیا۔ مہاراجہ کی طرف سے بادامی باغ میں عبداللہ سے مفاہمت کے بعد سرکار نے مکمل طور پر آزادیٔ تحریر وتقریر کو دبانا شروع کیا۔ دار وگیر کا یہ سلسلہ خاص کر اُن علاقوں میں زور پکڑتا گیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ سرینگر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ کسی مکان یا ہوٹل یا ہاؤس بوٹ میں کوئی بھی سیاسی اجتماع نہیں ہوگا۔ کشمیر مسلم کانفرنس کے ترجمان ''ملت'' اور ''جوہر'' کی اشاعت بند کردی گئی۔ روزنامہ ''ہمدرد''، ''کشمیر ٹائمز'' اور ہفت روزہ ''اصلاح'' کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہر لفظ کی اشاعت سے قبل اسے سرکار کے پبلسٹی آفیسر سے سنسر کروائیں۔ ان مقامی اخباروں کا صرف یہ قصور تھا کہ وہ کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کے خلاف تھے جسے ریاستی لوگوں کی مرضی کے بغیر یا یوں کہئے کہ ان کی مرضی کے خلاف عمل میں لایا جانا مقصود تھا''۔

بزاز کے بقول نیشنل کانفرنس اور دیگر ہندنواز تنظیمیں ان پابندیوں سے پوری طرح مستثنٰی تھیں۔ بزاز نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ روزنامہ ''ہمدرد'' کی کاپیاں اسے بیچنے والوں کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لی گئیں۔ انہیں بر سر عام نذرِ آتش کیا گیا اور پولیس خاموش تماشائی بن کے یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔

1947ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں صحافت مقصدیت کی راہ سے ہٹ کر مکمل

طور پر ایک ایسی عامیانہ اور بے رنگ سیاست میں ڈھل گئی جس میں حریفوں کی پگڑی اُچھالنا، غیر مقبول حکومتوں کی قصیدہ خوانی اور ذاتی مفادات کی تکمیل کے لئے ہر غلط قدم کو حق بجانب قرار دینا شامل تھا۔

اُدھر پاکستان میں مولانا عبدالمجید سالکؔ، مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر اور محمد دین فوقؔ اپنی زندگی میں کشمیر کی غلامی کے خلاف لڑتے لڑتے اور اپنا مجاہدانہ مشن منزلِ مقصود کی طرف لیتے ہوئے انتقال کر چکے تھے اور اِدھر کشمیر میں خدمت، غلام رسول عارف کا ہمدرد، غلام رسول عرفانی کا نیا سنسار اور بدری ناتھ مٹو کا مارتنڈ ایک محدود پیمانے پر اپنا کاروبار چلاتے رہے۔

1964ء میں جب کشمیر میں محاذ رائے شماری اور عوامی ایکشن کمیٹی کی طرف سے چلائی جانے والی ہندوستان سے الگ ہونے کی تحریک زوروں پر تھی تو ہفتہ وار محاذؔ اور حریتؔ نے اس مقصد کو تقویت بخشنے میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔ حکومتِ وقت کی طرف سے آزادیٔ رائے پر قدغن لگانے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا اور اس وقت کے ریاستی وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے عہد حکومت میں ایک درجن مقامی اخبارات کی اشاعت منسوخ کر دی گئی جن میں محاذؔ اور حریتؔ لازمی طور پر شامل تھے۔

بیسوی صدی کے ساتویں دہائی میں ہفت روزہ ''آئینہ'' اور میرے ہفتہ وار ''اقبال'' نے کشمیر میں ادبی صحافت کی آبیاری کی۔ ان دونوں اخباروں کے مضامین اور اداریے آج بھی ہماری موجودہ صورتحال کے لئے برمحل ہیں۔ ''اقبال'' کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ اس میں ہندوستان بھر کے اُردو ادیب اور شاعر اور دانشور لکھا کرتے تھے جن میں سے مجھے اس وقت سردار جعفریؔ، بشیر بدرؔ، ڈاکٹر وحید اختر، دلکش آفریدی، عشرت قادری بھوپالی، شمع افروز زیدی، بانو سرتاج، شمیم نکہت، لیلیٰ لکھنوی، حیات وارثی اور حسرت جے پوری کے نام یاد آتے ہیں۔

میری دانست میں ''آئینہ'' کے مدیر شمیم احمد شمیمؔ نے اُس وقت ایک نہایت ہی

غیر دانشمندانہ قدم اُٹھا کر جب اس نے اپنے مقبول اور معیاری ہفت روزہ کو اُس وقت کے اپنے مربی شیخ محمد عبداللہ کے مشورے سے ایک روزنامہ اخبار میں تبدیل کرلیا۔ یہ روزنامہ پھر مقامی اخباروں کی صف میں کوئی امتیازی مقام حاصل کرنے سے بھی محروم ہی رہا اور اس کی ساکھ بگڑ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اگر شمیم کے ''آئینہ'' کو بار بار یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد اُس کا ہفت روزہ ہی ہے اور اس کے روزنامہ کو کسی تذکرہ کا درخور نہیں سمجھا جاتا ہے۔

ریاست میں اور بالخصوص کشمیر میں اُردو صحافت کے دورِ جدید نے اگرچہ لوگوں میں اخبار بینی کا شوق ازسرِنو پیدا کرنے کا قابلِ تحسین کام سرانجام دیا ہے جس میں روزنامہ آفتاب سرفہرست ہے۔ وہاں اکثر اخبارات میں بدقسمتی سے زبان، املاء اور گریمر کا کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا البتہ ''کشمیر عظمیٰ'' اور ہفت روزہ ''چٹان'' کو اس خامی سے بہت حد تک مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک مستند اور قابلِ قبول صحافی بننے کے لئے اُردو زبان سے مکمل واقفیت اور اس کے لسانی علم پر مکمل عبور ایک لازمی امر ہے۔

ایک مقامی روزنامہ سے یہ چند سرخیاں میرے اس بیان کی تصدیق کیلئے کافی ہیں:

- باندی پورہ میں بزمِ شیعان پھر سے سرگرم ہو گیا ہے۔
- خالصہ ہائی سکول مگھرمل باغ میں کلچری زبان کا تربیتی کورس۔
- امرناتھ گپھا میں بھگوان شو کا ہم لنگ پوری طرح پگھل گیا۔
- بڑی تعداد میں ہم لنگ کا درشن کرنے والے کافی رنجیدہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

اخیر پر میں اس موضوع کے ساتھ بے انصافی کرنے کا مرتکب گردانا جاوٴں گا اگر میں دُوردَرشن اور مقامی پرائیوٹ ٹیلی ویژن چینلوں کا ذکر نہ کروں کیونکہ ٹیلی ویژن بھی صحافت کی جامع اصطلاح کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔

جہاں تک ہمارے دُوردَرشن کا تعلق ہے اس سے نشر ہونے والے اکثر اُردو پروگرام اور خبروں کے بلیٹن غیر معیاری ہونے کے علاوہ صحیح زبان کے استعمال سے محروم ہی ہوتے

ہیں ۔یہی حال پرائیوٹ ٹی وی چینلوں کا بھی ہے جہاں سے خاص طور پر اُردو خبریں دیکھتے وقت ناظر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ نہ جانے کس ملک کی بولی جانے والی اُردو سن رہا ہے جس میں سنگ بنیاد کو مونث اور رسم اجزاء کو مذکر باندھا جاتا ہے۔

اِن چینلوں کے منتظمین کو چاہئے کہ وہ اپنے اہلکاروں کو اُردو اور کشمیری زبانوں کے بنیادی تربیتی کورس کے ذریعہ ضروری باتیں سکھانے کا انتظام کریں اور مجھے یقین ہے کہ اس کارِ خیر میں مقامی زبان دان اور کہنہ مشق ادیب بلاشبہ رضا کارانہ طور پر ان نشریاتی اداروں کی رہبری کرنے میں خوشی محسوس کریں گے لیکن اس سلسلے میں دُور درشن اور پرائیوٹ نشریاتی اداروں کا ردعمل مایوس کن ہی رہا ہے۔ساتھ ہی ان چینلوں سے وابستہ نوجوانوں کو یہ شعر زبانی یاد کر کے اس پر اپنے ہی مفاد کی خاطر پوری طرح عمل پیرا ہونا چاہئے کہ :

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہنا
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے



جوشؔ ملیح آبادی اور کشمیر

گزشتہ صدی کی چوتھی دہائی میں ہندوستان اور کشمیر میں آزادی کی تحریکیں باضابطہ طور پر ایک ساتھ شروع ہوئیں۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں ''بھارت چھوڑ دو'' کی تحریک حریت کے بعد مئی 1946ء میں کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی میں ''کشمیر چھوڑ دو اور بیع نامہ امرتسر کو توڑ دو'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے غلام کشمیری عوام آزادی کا پرچم لہراتے شخصی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا عزم کر کے میدان میں کود پڑے۔

بیع نامہ امرتسر اُس بدنام زمانہ سودابازی کا نام ہے جو پنجاب کے شہر امرتسر میں 16 مارچ 1846ء کو طے پائی جس کی رو سے انگریز سامراج نے جموں کے ڈوگرہ گلاب سنگھ کے ہاتھ سارا کشمیر بشمولِ انسان وحیوان اور چرند وپرند صرف 75 لاکھ نانک شاہی روپے میں فروخت کر دیا جو آج کے پچاس لاکھ روپے کے برابر ہوتے ہیں۔

اس انسان کش بیع نامہ پر اقبال نے یوں اظہار رائے کیا:

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوئے (1)
دہقان وکشت و جوئے و خیابان فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

مہاتما گاندھی نے اسے بکری پتر کا نام دیا۔ جواہرلال نہرو نے اسے ریاستی عوام کی غلامی کی دستاویز کہا۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اسے نیلامی کے نام کا سند نامہ قرار دیا اور مولانا غلام رسول میر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''1846ء میں انگریزوں

نے کشمیر کو اس طرح فروخت کیا کہ امریکی آبادکاری کے ابتدائی دور میں حبشی غلام بھی شاید اس طرح بکے ہوں''۔ (2)

حفیظ جالندھری نے اس غیر انسانی اور بہیمانہ فعل کے شرمناک پہلوؤں پر یہ طنز کیا:

وادیاں، کہسار، جنگل، پھول، پھل اور سب اناج
ڈھور ڈھنگر آدمی ان سب کی محنت کام کاج
یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد ہیں سب زرخرید
ان کے بچے بچیاں اولاد ہیں سب زرخرید

گلاب سنگھ کے پاس اُس وقت چونکہ ساری رقم موجود نہیں تھی لہٰذا اُس نے بقیہ پچیس لاکھ اکتوبر کی پہلی تاریخ تک ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس طرح سے انگریزوں نے چند روپے فی کس کے حساب سے پوری کشمیری قوم کو ڈوگرہ راج کے چنگل میں دے دیا۔

غلام ہندوستان کی حالت زار کو دیکھ کر علامہ اقبال اس لحاظ سے اس ناگفتہ بہ صورتحال سے دوگونہ پریشان اور دل برداشتہ تھے کہ سارے ملک کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا وطن مالوف کشمیر بھی شخصی راج کے آہنی پنجے تلے کراہ رہا تھا اور عام کشمیری ظلم واستبداد کی چکی میں پس رہا تھا۔ اس صورت میں عام لوگوں کی بے حسی اور بے دلی کا مشاہدہ کر کے انہوں نے کشمیر کے بارے میں یہ نوحہ لکھا :

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد زسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے زخود شرم سارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینہ او دل بے قرارے

اور:

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تاخاک بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغان سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

جوشؔ ملیح آبادی کا دل بھی وطن کی غلامی پر خون کے آنسو روتا تھا اور اقبال کی طرح اسے بھی یہ قلق تھا کہ ہندی قوم اپنی آزادی کے لئے جان بکف ہوکر میدانِ کارزار میں کودنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ اپنے ہم وطنوں کو ''ذلیل غلامانِ روسیاہ'' کہہ کے پکارتے ہیں اور خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ انہیں ہندوستان میں کیوں پیدا کیا:

میرے رجز سے لرزہ براندام ہے زمیں
افسوس تیرے کان پر جوں رینگتی نہیں
تو چپ رہا، زمین ہلی ، آسمان ہلا
تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا
ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟

ہندوستان کی آزادی کے لئے جن لاتعداد سرفروشوں اور عام شہریوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا، آزادی کے بعد اُن کی حالت جوں کی توں رہی اور آزاد ہند کے فوائد صرف اُن افراد تک ہی محدود ہو کے رہ گئے جنہوں نے آزادی کے نام پر عام لوگوں کا استیصال اور ذاتی مفادات کے حصول کو اپنا شعار بنالیا تھا۔

جوشؔ ملیح آبادی نے بھی ایک عوام پرور آزادی کا خواب دیکھا تھا لیکن 1947ء کے بعد جو کچھ ان کی نظروں نے دیکھا اس کی وجہ سے وہ بے حد رنجیدہ ہوئے اور انہوں

نے نظم ''ماتم آزادی'' میں اپنی اس مایوسی کا اظہار یوں کیا :

دولت ملی تو اور بھی نادار ہوگئے
صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہوگئے
اُترا جو بار اور گراں بار ہوگئے
آزاد یوں ہوئے کہ گرفتار ہوگئے

پگھلا جو آسماں تو زمیں تنگ ہوگئی
''یوں پَو پھٹی کہ صبح چمن دنگ ہوگئی''

شاعر کہیں کا بھی ہو لیکن اُس کا ذہن دوسرے خطوں سے تعلق رکھنے والے ہم سخنوں کے ساتھ فکری طور پر ہمیشہ وابستہ رہتا ہے۔ اِسی لئے کئی شاعروں کے یہاں ہم خیالات اور محسوسات کی یکسانیت اور یک رنگی حیران کن حدتک موجود پاتے ہیں۔اُدھر جوشؔ نے نام نہاد آزادی پر طنز کرتے ہوئے مندرجہ اشعار کہے اور اِدھر شاعر کشمیر غلام احمد مہجورؔ نے بھی ہند کی آزادی کے بعد اسی قسم کے خیالات کو اظہار کی شکل دی۔ یہ اشعار دراصل کشمیری میں ہیں اور ان کا اردو ترجمہ کیفیؔ اعظمی نے یوں کیا ہے:

آزادی ہمارے گھر آئی آزادی کا کیا کہنا
آتی نہیں تھی پر آئی آزادی کا کیا کہنا
یہ محلوں پر منڈلاتی ہے سونا چاندی برساتی ہے
سب کھنڈروں سے شرماتی ہے جب آئی جھکا کے سر آئی
بھوکوں کو بہلائے کیسے پیاسوں کو چھلکائے کیسے
جنتا کو سمجھائے کیسے اوروں کی تجوری بھر آئی
سب روتے ہیں کچھ گاتے ہیں سب کھوتے ہیں کچھ پاتے ہیں
پھل محنت کے لُٹ جاتے ہیں انصاف عجب لے کر آئی
آزادی ہمارے گھر آئی (3)

کشمیر پر جوشؔ کی کہی ہوئی دو نظمیں "اے جوانانِ کشمیر" اور "اے جنتِ کشمیر" آج بھی اہل کشمیر کے قلب ونظر کو جذبہ حُب الوطنی اور حریت پرستی کے جذبات سے گرماتی ہیں۔

ان منظومات میں جوشؔ نے حسب عادت اپنے زوردار اسلوب کے ذریعہ اہل کشمیر کے تیئں آزادی اور جمہوریت کے لئے ان کی جدوجہد کے ساتھ زبردست یکجہتی کا برملا اظہار کیا ہے۔ یہ دونوں نظمیں چونکہ اب تقریباً ناپید ہیں لہٰذا انہیں یہاں درج کرنا قارئین کی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا:

اے جوانانِ کشمیر

اے جنتِ کشمیر کے بیدار جوانو
اے ہمت مردانہ کے ذی روح نشانو
سو بات کی یہ بات ہے اس بات کو مانو
جینے کا جو ارمان ہے تو موت کی ٹھانو

بے غرق ہوئے کوئی اُبھرتا ہی نہیں ہے
جو قوم پہ مرتا ہے وہ مرتا ہی نہیں ہے

بے ذوقِ وفا کوئی تہمتن نہیں بنتا
بے سلسلۂ برق نشیمن نہیں بنتا
سونا نہیں تپتا ہے تو کندن نہیں بنتا
جو گھن نہیں کھاتا ہے وہ آہن نہیں بنتا

جنگل میں جو لذت کش پیکاں نہیں ہوتا
وہ شیر کبھی شیر نیستاں نہیں ہوتا

سوتے ہوئے دھارے کبھی طوفاں نہیں بنتے
جو قید نہ ہوں یوسف کنعاں نہیں بنتے

مرتے جو نہیں عیسائے دوراں نہیں بنتے
جو موت سے ڈرتے ہیں وہ انساں نہیں بنتے

بے سوزِ نم اشک فشانی نہیں ملتا
بے آگ میں کودے ہوئے پانی نہیں ملتا

کمزور کو آسودگیٔ دل نہیں ملتی
جب تک نہ جلے شمع کو محفل نہیں ملتی
کانٹوں سے جسے لذت کامل نہیں ملتی
اس رہرو نااہل کو منزل نہیں ملتی

گرداب میں جس شخص کو جینا نہیں آتا
اُس شخص کا ساحل پہ سفینہ نہیں آتا

جب تک کہ ہر اک ذرہ پر افشاں نہیں ہوتا
اک پھول بھی گلزار میں خنداں نہیں ہوتا
گلشن میں کبھی رقص بہاراں نہیں ہوتا
جب تک کہ ہواؤں پہ گریباں نہیں ہوتا

جب تک دل یوسف پہ گرانی نہیں آتی
رخسار زلیخا پہ جوانی نہیں آتی

ہوتا ہے تلاطم کا اب آغاز جوانو
سیلاب میں در آؤ بصد ناز جوانو
یہ موج یہ گرداب ہے جانباز جوانو
دو وقت کی آواز پر آواز جوانو

دنیا میں کسی خوف کے قابل نہیں ہوتے
جو شیر کے بچے ہیں وہ بزدل نہیں ہوتے

طوفان کو ٹھکراؤ ہواؤں کو بدل دو
دریاؤں کو روندو تو پہاڑوں کو کچل دو
مردانہ بڑھو موت کو پیغام اجل دو
پھولوں کی تمنا ہے تو کانٹوں کو مسل دو

تخریب کا جب تک کہ تلاطم نہیں آتا
تعمیر کے ہونٹوں پر تبسم نہیں آتا

سینوں کو چلو عرصۂ ہمت میں اُبھاریں
ہاں آؤ طمانچہ رُخِ سیلاب پر ماریں
شیروں کی طرح آؤ کچھاروں میں ڈکاریں
پلتی ہیں سدا خون کے دھاروں میں بہاریں

عزت کو خرابات قرینے نہیں دیتی
دُنیا کبھی نامرد کو جینے نہیں دیتی

اے جنتِ کشمیر

عالم تیری برنائی گل رنگ کا شیدا
کونین کے دل میں ترے جلوے کی تمنا
آفاق کے شانے پر تیری زُلفِ گرہ گیر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر
ہاں تجھ کو جلانے کی تمنا میں مریں گے
چلتی ہوئی تلوار سے ہم قطع کریں گے
پہنائیں تو اغیار ترے پاؤں میں زنجیر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر
منڈلائیں گے شاہیں جو تری پاک فضا پر
اغیار نیاموں سے نکالیں گے جو خنجر
ہم جنگ کے میدان میں چمکائیں گے شمشیر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر
ظلمات کو رنگ اپنا جمانے نہیں دیں گے
اُس خاک پہ ہم رات کو چھانے نہیں دیں گے
جس خاک کا ہر ذرہ ہے خورشید کی تصویر
اے جنتِ کشمیر اے جنتِ کشمیر

اس کے بعد جوشؔ ملیح آبادی کا ایک بار اور کشمیر آنا ہوا جس کی تفصیلات دستیاب نہیں کہ کیا وہ دورہ نجی تھا یا پھر کسی مشاعرے میں اُن کی شرکت کے لئے انہیں دعوت دی گئی تھی۔ بہر حال اس دورے کی تصدیق میں انہوں نے جنتِ کشمیر میں آدم کی واپسی کو تمثیلی طور پر پیش کرتے ہوئے یہ باغیانہ اعلان کیا:

ممنوعہ شجر سے لطف پیہم لینے
نسیاں کی گھنی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو پھر کاشمر آپہنچا جوشؔ
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

چونکہ 1931ء میں جب کشمیر کی تحریک حریت کی داغ بیل ڈالی گئی تو اُسی سال جوشؔ نے ایک مشہور رباعی تحریر کی جس کے مضمون کے بارے میں یہ زبردست امکان موجود ہے کہ اُس کا تعلق کشمیر ہی سے ہے:

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی
ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر
غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

1940-41ء کے آس پاس جوش ملیح آبادی ایک کل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے کی غرض سے کشمیر آئے تو یہاں وادی کے سب سے مقبول سیاسی رہنما شیخ محمد عبداللہ نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ یہ تاریخی مشاعرہ سرینگر میں ایس پی کالج کے ہال میں منعقد ہوا جس میں بقول امین کامل ”جوشؔ کے علاوہ حفیظ جالندھری اور فراق گورکھپوری بھی موجود تھے“۔ جوش کو شیخ صاحب سے زبردست عقیدت تھی اور کشمیری عوام میں اُن کی بے مثال مقبولیت کو دیکھ کر اس جذبۂ احترام میں اور اضافہ ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے جوشؔ نے دیکھا کہ شیخ صاحب سامعین میں خواتین کے ایک مجمع

کے قریب بیٹھے ہیں تو انہوں نے شیخ صاحب کو آواز دی ''قبلہ! اب زنانے سے ذرا مردانے میں تو تشریف لائیے''اور اس کے بعد جوش ملیح آبادی نے اپنی گھن گرج والی آواز میں شیخ عبداللہ کی مدح سرائی میں یہ نظم سنائی:

کشور ہند میں بحمد اللہ

میں ہوں جوشؔ ایک رند نامہ سیاہ

لعل و الماس سے دمکتی ہے

فقر کے باوجود میری کلاہ

میرے آگے وہ بحر ہے پایاب

نہیں ملتی خضرؔ کو جس کی تھاہ

سرکشی کے طفیل وہ لا ہوں

نہیں بڑھتا جو سوے الا اللہ

طرح دارانِ شہر کا خادم

تاجداران دہر کا بدخواہ

کام ہے شیخ سے نہ پنڈت سے

دیر ہی پر ہے نے حرم پہ نگاہ

رند ہوں رندبھ نہیں سکتی

شیخ صاحب سے میری رسم وراہ

ان کی محفل میں ہے چراغ ثواب

میری محفل میں آفتابِ گناہ

ان کی لوح جبیں پہ داغ سجود

میرے آئینے میں تجلی ماہ

ہاں مگر ایک شیخ ہے ایسا

جس پہ ٹھہری ہے مدتوں میں نگاہ
جس کی ہر اک روش ہے حسب مراد
جس کا ہر اک اصول ہے دل خواہ
سخت کو توڑتا ہے جس کا نفس
تاج کو روندتی ہے جس کی نگاہ
ہے جو اس تیرہ دورِ باطل میں
حق نگہ حق شناس حق آگاہ
نام اس شیخ کا بتاؤں تمہیں
دل رنداں میں بھی ہے جس کی چاہ
چارہ گر رہنما غریب نواز
شیر کشمیر شیخ عبد اللہ
صرف اسی شیخ سے محبت ہے
ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ (4)

شیخ محمد عبداللہ نے اپنے سوانح حیات میں جوش کے تئیں اپنی شفقت اور قربت کا ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ ''قبلۂ رندان جوش ملیح آبادی بھی میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ ان کا پٹھانوں کا طنطنہ اور ان کا شاعرانہ جلال انہیں خاصے کی شخصیت بنادیتا ہے۔ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد ان کے قدر دانوں میں سے تھے۔ وہ مئے گلفام کے بڑے رسیا ہیں چونکہ میں کبھی اس شئے کی طرف رغبت پیدا نہیں کرسکا اس لئے وہ کبھی کبھی اپنے شاعرانہ انداز میں مجھے چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ انہوں نے میرے بارے میں نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی چھیڑ خوانی کا یہ انداز موجود ہے۔ بعد میں جوش صاحب اپنے کچھ دوستوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر پاکستان چلے گئے۔ ان کے جانے سے اُن کے دوستوں کو صدمہ تو ہوا ہی لیکن خود جوش بھی مزے میں نہ رہے''۔ (5)

یہ چھوٹی سی بات بھی حسنِ اتفاق ہے کہ جوشؔ اور عبداللہ دونوں کی تاریخ پیدائش ایک ہی ہے۔ جوشؔ 5/دسمبر 1898ء کو اس عالم ہست و بود میں آئے اور شیخ عبداللہ بھی اسی دن 1905ء میں پیدا ہوئے۔ گویا جوشؔ عمر میں عبداللہؔ سے سات سال بڑے تھے۔ یہ واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ دونوں کا انتقال ایک ہی سال یعنی 1982ء میں ہوا۔

پاکستان جانے کے بعد وہاں کی سرکار نے اگرچہ جوشؔ کو شاعرانِ پاکستان میں شامل کر کے اُن کے نام سے پانچ روپے کا ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا لیکن وہ اپنے قیامِ پاکستان کے بارے میں یہی کہتے رہے ع

یوں کراچی میں ہوں میں جس طرح کوفے میں حسینؓ

شیخ محمد عبداللہ کی یہ رائے صحیح ثابت ہوئی کہ جوشؔ آخری دم تک پاکستان میں بدمزگی کے دن گذارتے رہے۔

1953ء میں ریاست کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی سرکار کو برخاست کئے جانے کے ساتھ ہی ان کی گرفتاری کے بعد ریاست میں سیاسی حالات ایک یا دوسری طرح دگرگوں ہی رہے اور اس فردوس ارضی کو بدقسمتی سے متواتر طور پر ایک پرامن ماحول، سازگار فضا اور ترقی پذیر معاشرہ نصیب نہیں ہو سکا۔

یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ 1953ء کے بعد جوشؔ ملیح آبادی پھر کبھی کشمیر نہیں آئے لیکن وہ یہاں کے اپنے مختصر قیام کی تلخ و شیریں یادیں دل میں بسائے کشمیر کو دور سے تصورات میں دیکھتے رہے ہوں گے اور اس کے عوام کی بہتری اور بہبود کی دعائیں انہوں نے اقبالؔ کے اس شعر کی طرح ضرور اور بار بار مانگی ہوں گی۔

ازاں مئے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اس مقالے میں جوشؔ کی جو منظومات شامل کی گئی ہیں وہ کشمیر کے مخصوص سیاسی پس منظر میں تخلیق کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جوشؔ نے کشمیر کے حسن و جمال پر ایک اور نظم تحریر کی

ہے۔اس خوبصورت نظم میں اگرچہ کشمیر کا ذکر صرف ایک بار آیا ہے لیکن اس کی وضع قطع اور اس کا سارا منظر نامہ صرف اور صرف کشمیر کی فطری خوبصورتی اور قدرتی دل نشینی کا بیان ہے۔اس واحد نظم کو یہاں پر درج کر کے اسے محفوظ کرنا ہمارے لئے ایک بہت بڑی خوشی کا سبب ہے۔''مناظرِ سحر'' کے عنوان سے تخلیق کردہ یہ فن پارۂ جوشؔ یوں ہے:

کیا روح فزا جلوۂ رخسار سحر ہے
کشمیر دل نواز ہے فردوسِ نظر ہے
ہر پھول کا چہرہ عرق حسن سے تر ہے
ہر چیز میں ایک بات ہے ہر شئے میں اثر ہے

ہر سمت بھڑکتا ہے رخِ خور کا شعلہ
ہر ذرۂ ناچیز میں ہے طور کا شعلہ

لرزش وہ ستاروں کی وہ ذرّوں کا تبسم
چشموں کا وہ بہنا کہ فدا جن پر ترنم
گردوں پہ سیاہی وسپیدی کا تصادم
طوفان وہ جلوؤں کا وہ نغموں کا تلاطم

اُڑتے ہوئے گیسو وہ نسیم سحری کے
شانوں پہ پریشان ہیں یا بال پری کے

وہ پھیلنا خوشبو کا وہ کلیوں کا چٹکنا
وہ چاندنی مدھم وہ سمندر کا جھلکنا
وہ چھاؤں میں تاروں کی گُلِ تر کا مہکنا
وہ جھومنا سبزے کا وہ کھیتوں کا لہکنا

شاخوں سے ملی جاتی ہیں شاخیں وہ اثر ہے
کہتی ہے نسیمِ سحری ''عید سحر ہے''

خنکی وہ بیاباں کی وہ رنگینیٔ صحرا
وہ وادیٔ سرسبز وہ تالاب مصفا
پیشانیٔ گردوں پہ وہ ہنستا ہوا تارا
وہ راستے جنگل کے وہ بہتا ہوا دریا

ہر سمت گلستان میں وہ انبار گلوں کے
شبنم سے وہ دھوئے ہوئے رُخسار گلوں کے

وہ روح میں انوارِ خدا صبح وہ صادق
وہ حسن جسے دیکھ کر ہر آنکھ ہو عاشق
وہ سادگی انسان کی فطرت کے مطابق
زریں وہ اُفق نور سے لبریز وہ مشرق

وہ نغمۂ داؤد پرندوں کی صدا میں
پیراہن یوسف کی وہ تاثیر ہوا میں

وہ برگ گل تازہ وہ شبنم کی لطافت
اک حسن سے وہ خندۂ سامان حقیقت
وہ جلوۂ اصنام وہ بت خانے کی زینت
زاہد کا وہ منظر وہ برہمن کی صباحت

ناقوس کے سینے میں صدائیں وہ فغاں کی
وہ حمد میں ڈوبی ہوئی آواز اذاں کی

آقا کا غلاموں سے یہ ہے قرب کا ہنگام
دل ہوتے ہیں سرشار فنا ہوتے ہیں آلام
چھا جاتی ہے رحمت تو برس پڑتے ہیں انعام
اس وقت کسی طرح مناسب نہیں آرام

رونے میں جو لذت ہے تو آہوں میں مزا ہے
اے روح! خودی چھوڑ کہ نزدیک خدا ہے (6)



حوالہ جات

(1)- یہ شعر ''جاوید نامہ'' میں درج ہے جس کی اشاعت 1932ء میں ہوئی۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ مسئلہ کشمیر اس کے پورے سولہ سال بعد مجلس اقوام متحدہ میں پیش کیا گیا۔

(2)- اقبال اور تحریک آزادئ کشمیر، غلام نبی خیالؔ، کشمیری رائٹرس کانفرنس، سرینگر کشمیر؛ 1997، ص21۔

(3)- خیابان کشمیر، مرتبہ غلام نبی خیالؔ، جموں و کشمیر کلچرل اکادمی سرینگر۔1998، ص 112۔

(4)- حیرت ہے کہ کشمیر پر جوشؔ کی تحریر کردہ دو نظمیں اور شیخ عبداللہ پر اُن کی یہ نظم حال ہی میں اشاعت پذیر کلیات جوشؔ ملیح آبادی میں شامل نہیں ہیں۔

(5)- آتشِ چنار، شیخ محمد عبداللہ۔ علی محمد اینڈ سنز سرینگر۔1986، ص 268-267۔

(6)- کلیات جوشؔ - مرتبہ عصمت ملیح آبادی، فرید بک ڈیپو دہلی، 2007۔ص 62-61۔



جموں و کشمیر میں اُردو کا مستقبل

آپ میں سے کئی حضرات نے ملک کے ایک ممتاز عالم دین مولانا وحید الدین خان کے جریدے ''الرسالہ'' میں شائع شدہ اس واقعہ کے بارے میں پڑھا ہوگا کہ ایک مسلمان نوجوان جب یورپ کے ایک ملک میں روزگار کی تلاش میں گیا تو وہاں انٹرویو کے دوران اس سے اس کا نام پوچھا گیا۔ اس نے اپنا بتایا جس سے اس کی مذہبی شناخت کا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ پھر جب اس سے اس کے مذہب کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں ایک مسلمان ہوں یہ سنتے ہی انٹرویو لینے والے اصحاب میں سے ایک نے فوراً کہا کہ پھر تو دہشت گرد ہوں گے۔

چونکہ اب تو ایک منصوبہ بند مہم کے تحت ہندوستانی مسلمان نوجوان مبینہ طور پر ایک نام نہاد دہشت گرد ہے اور چونکہ اُردو زبان کو بھی کل کے ہندوکٹر پرستوں اور آج کے سنگھ سے مسلمانوں کے ساتھ جوڑ رکھا ہے لہٰذا اُردو زبان کو بھی غالباً اسی نظر سے دیکھ کر اس کے خاتمے کی درپردہ کوششیں برابر جاری ہیں لیکن یہ زبان اتنی سخت جان ثابت ہوئی ہے کہ پے در پے وار سے اسے اگرچہ مضروب کرتے رہے ہیں لیکن وہ اس کے وجود کو مٹانے میں ناکام ہی ثابت ہوئے ہیں۔

اُردو زبان کا مستقبل بجائے خود اس ہندوستان میں بھی صاف اور ہمت افزاء نہیں ہے جہاں اس نے دلّی، لکھنؤ اور حیدرآباد جیسے ثقافتی مرکزوں میں جنم لیا اور وہیں اس کی پرورش اور پرداخت بھی ہوئی، تو اس حقیقت کے پیش نظر جموں و کشمیر کے حوالہ سے بھی اس

عظیم زبان کا آنے والا کل اتنا تاناک نہیں دکھائی دے رہا ہے جتنا کہ اس کے عاشق اور اُردو داں توقع رکھتے تھے۔

دراصل تقسیم ہند کے بعد ہی ہندی کو قومی زبان بنائے جانے کا اقدام ایک غیر حقیقی کارروائی تھی جسے چند انتہا پسندوں نے ایک قوم پرست گرمی کا نام دے کر اُردو کے ساتھ بے انصافی کا مجرمانہ ارتکا کیا۔ اس سلسلہ میں جی ڈی گارڈے یہ واضح موقف بیان کرتے ہیں کہ ''اُردو حالانکہ سارے ہندوستان میں مسلمانوں کی مادری زان نہیں تھی۔ مدارس میں مسلمان، تامل، کیرالہ میں ملیالم ممبئی میں مراٹھی، احمد آباد میں گجرات، ڈھاکہ اور کلکتہ میں بنگالی، لاہور اور امرتسر میں پنجاب، کراچی میں سندھی، سرینگر میں کشمیری اور پشاور میں پشتو بولتے تھے۔ اُردو ایک مخلوط زبان تھی لیکن اُتر پردیش کے ہندی کے حامی بنیادی پرستوں کو تقسیم ہند کے بعد زبانوں کے تنازعہ میں فوقیت حاصل ہوئی اور پھر ہندوستانی نہیں بلکہ ہندی کو آئین ہند میں قومی زبان بنایا گیا اگرچہ مہاتما گاندھی بھی اس اقدام کے مخالف تھے۔ اس کے بعد ہندی زبان سے زیادہ سنسکرت آمیز بنائی گئی جو ایک عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہی رہی۔ اُردو کھڑی بولی یعنی سیدھے سادے انسانوں کی زبان تھی یہ سنسکرت برہمن یا فارسی دانشور کی زبان نہیں تھی۔

آج تامل لوگ سنسکرت آمیز ہندی کے زبردست مخالفین میں شامل ہیں۔ انہوں نے خوشی خوشی اُردو کو قبول کر لیا ہوتا اگر انہیں یہ آزادی ہوتی کہ وہ اُردو اپنے تامل رسم خط میں ہی لکھیں۔

اب اُردو ہندوستان میں تھرتھراہٹ کے عالم میں سانس لے رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بے عملی ہے جب کہ یہ زبان ہندو مسلم اشتراک کی بدولت پہلے پہل جوبن پر تھی۔(1)

کسی زبان کی ترویج اور ہمہ گیر تشہیر میں اُخباروں کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن آج جب کہ ملک کو آزاد ہوئے ساٹھ سال سے زائد عرصہ گذر چکا ہے ہماری نظروں

میں اُردو زبان میں اس وقت بھی ایسا کوئی اخبار موجود نہیں ہے ''انڈین ایکسپریس'' یا ''ٹائمز آف انڈیا'' کی طرح ملک گیر اشاعت کا حامل ہو جو ہندوستان کے ہر شہر میں پڑھا جاتا ہو۔

اُردو کے اخبارات جہاں سارے ہندوستان میں علاقائی سطح تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں، وہاں جموں وکشمیر میں بھی ان کی حالت جوں کی توں ہے۔ حیرانی کا مقام یہ ہے کہ اب تو اس ریاست میں اُردو کی بہ نسبت انگریزی اخبار قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کررہے ہیں اور اس وقت اسی زبان کا ایک روزنامہ ریاست بھر میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار بن چکا ہے۔ اس صورتحال کی وجوہات میں یہ حقیقت بھی شامل ہے کہ اُردو اخباروں کے مالک اُردو زبان کے مبلغ نہیں بن سکے ہیں اور نہ ہی انہیں یہ کام اپنے ذمہ لینا چاہئے لیکن ان کے اخباروں کے صفحات جس طرح سطحی اور نقل شدہ مضامین، ایک ہی قسم کی پٹی پٹائی خبروں اور غیر معیاری زبان میں تحریر کئے گئے اداریوں سے بھرے پڑے رہتے ہیں وہ قابل افسوس ہے۔ حد یہ ہے کہ سرینگر میں اس وقت اُردو روزناموں کے پاس خبریں جمع کرنے والا اور اخبار کے دفتر سے باہر کام کرنے والا نامہ نگار یا نمائندہ تک موجود نہیں ہے اس پر طرہ یہ کہ اب تو گزشتہ دو دہائیوں کی برکت سے ایسے ایسے اصحاب بھی اخبارات کے مالک اور مدیر بن گئے ہیں جو انگریزی تو کیا اُردو میں بھی ایک صفحہ صحیح زبان اور املا کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ 2008ء میں کشمیر یونیورسٹی کے فاصلاتی نظام تعلیم کے شعبہ نے ایک مناظر کا اہتمام کیا جس میں مہاراشٹر کے ایک لاعلم اور نیم خواندہ دانشور نے یہ کہہ کر بھی شرکائے محفل کو ششدر کر دیا کہ سارے مہاراشٹر میں اُردو زبان بولی اور پڑھی جاتی ہے جبکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے جس کی مثال یہ ہے کہ مہاراشٹر کے مسلم مُلّا اور مساجد کے امام بھی جب بات کرتے ہیں تو اس ہندی سے بھی زیادہ ناقابل فہم الفاظ اور تراکیب کا استعمال کرتے ہیں جو غالباً سنسکرت کے کسی ماہر برہمن کی سمجھ میں بھی نہ آسکے۔

محبانِ اُردو کو ان طفل تسلیوں سے بہلانے کے برعکس یہ سوچنا چاہیئے کہ اُردو کی بقاء اور نشو ونما کے لئے کیا کچھ کیا جائے۔ اب کسی بھی وقت ایک پرائیوٹ ٹیلی ویژن چینل ای ٹی وی اُردو دیکھیں تو آپ کو خود بہ خود معلوم ہوگا کہ کرناٹک، مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کے علمائے اسلام اور مذہبی رہنما بھی یا تو بالترتیب کنڑ، مراٹھی اور تیلگو میں بات کریں گے یا پھر ہندی کا سہارا لیں گے۔ اُردو زبان کے المیہ میں اس کے اپنے گھر یوپی کا تو یہ حال ہے کہ وہاں کے مسلمان اب اُردو نہیں پڑھتے اور ان کے بچے تو اُردو رسم خط سے بھی نا آشنا ہیں۔ ان کا یہ شکوہ بجا ہے کہ اُردو کے نام پر اگرچہ جگہ جگہ مدارس موجود ہیں لیکن سرکاری مدرسوں میں اُردو پڑھانے والا کوئی مدرس دُور دُور تک کہیں نظر نہیں آتا۔ اُردو کے مراکز میں اب دکانوں کے سائن بورڈ بھی اُردو زبان میں نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ میں تو مجھے اُردو اکادمی کی عمارت ایک بھوت بنگلہ جیسی نظر آتی جہاں ویرانی ہی ویرانی چھائی ہوئی تھی اور اس کے تنگ و تاریخ اندرون میں اُردو کے اساتذہ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، غالب، محمد حسین آزاد، داغ، حالی وغیرہ کی تصاویر مشکل سے دکھائی دیتی ہیں اور وہ بھی زبانِ حال سے یہی دہائی دے رہی ہیں کہ خدارا ہمیں اس اندھیارے سے نکال کر کسی کھلی اور روشن جگہ پر لے جاؤ۔

جب میں نے لکھنؤ کے مشہور کتاب گھر دانش کدہ میں نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی کی کوئی بھی کتاب تلاش کی تو مجھ سے کہا گیا کہ آثر صاحب کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے کیونکہ نہ ہی ان کی کتابیں اب کوئی شائع کرتا ہے اور نہ ہی ان کے خریدار موجود ہیں۔ یہ باتیں غالباً چھوٹی سی لگیں لیکن انہی کے تانے بانے سے ہم اُردو کے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

1889ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اُردو کو ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری زبان بنایا۔ اصل میں وہ یہ جگہ ڈوگری کو دیتا کیونکہ وہ خود ڈوگری بولنے والا جموں کا مہاراجہ تھا لیکن چونکہ ریاست کے دیگر دو اہم خطوں یعنی کشمیر اور لداخ ڈوگری بولی سے قطعاً نا آشنا تھے لہٰذا

اُسے بادل ناخواستہ اُردو ہی کو سرکاری زبان کا درجہ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ حالانکہ ریاست کے ان تینوں صوبوں یعنی کشمیر، لداخ اور جموں میں عوام کی مادری زبان بالترتیب کشمیری، لداخی اور ڈوگری ہے ۔ ہمارا ایک ادیب اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ کشمیر کے لوگ کشمیری، جموں کے لوگ ڈوگری اور لداخی بودھی زبان کی ترویج وترقی چاہتے ہیں لیکن کوئی دانشور بشمول اس قلمکار کے اُردو کا مقدمہ لڑنے کو تیار نہیں ۔(2)

جموں وکشمیر میں اُردو کو سرکاری زبان تو بنایا گیا لیکن ایسا کون سا سرکاری کام ہے جو اس زبان میں کیا جاتا ہے ہمارے سیاست دان یا تو ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کرتے ہیں یا وہ انگریزی بولتے نظر آتے ہیں اور اُردو میں کبھی کبھی ٹیلی ویژن پر نمودار ہونے والے جو سرکاری افسر بات کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی اُردو کی ناک کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب اُردو سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے قائم شدہ گجرال کمیٹی کے ممبران اندر کمار گجرال کی سربراہی میں سرینگر آئے تا کہ وہ کشمیر میں بالخصوص اور سارے ملک میں اُردو کی صورتحال کا جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کریں تو وادی کے ایک دانشور اور سابق وزیر مرحوم پیر غیاث الدین نے گجرال صاحب کے سامنے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اُردو کو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان 1947ء کے بعد بھی جاری رکھنے کے تعلق سے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے جماعت اسلامی کے ایک کارکن کا رول ادا کیا ہے جو اُردو کو مسلمانوں ہی کی زبان سمجھتی ہے۔ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے اس واقعہ کے حوالے سے بحث وتمحیص کی کافی گنجائش موجود ہے۔

جموں وکشمیر کے سرکاری اسکولوں میں اُردو زبان کی تدریس وتعلیم کچھ عرصہ تک تو جاری رہی لیکن جب پرائیوٹ سطح پر انگریزی کے ذریعہ تعلیم دینے والے لاتعداد اسکول ریاست کے چاروں طرف اور خاص کر شہروں اور قصبوں میں قائم ہوئے تو ریاستی سرکار نے بھی عاقبت اندیشی کا مظاہرہ کر کے انہی اسکولوں کے نقش قدم پر چل کر اُردو زبان کو مدارس سے خارج کر دیا۔

ایسے بدترین اور افسوس ناک حالات میں اس ریاست میں اُردو کے مستقبل کو سنوار نے کا کام جو ادارے کر سکتے ہیں ان میں ریاستی کلچر اکادمی، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور دانش گاہیں شامل ہیں جو اس سلسلہ میں اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں لیکن اُردو کے تحفظ اور اس کی دائمی حیثیت کو زک پہنچانے کی غرض سے ریاست کے ہزاروں مدارس سے اُردو کو جس طرح نکالا گیا وہ ایک حیران کن امر ہے۔اُردو کشمیریوں کی دوسری اور بے حد عزیز زبان ہے اس کے ساتھ اس قسم کا معاندانہ اور متعصّبانہ سلوک بہر حال قابلِ ملامت ہے۔

یہاں اس خوش آئند امر کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے اگر چہ جموں و کشمیر میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ بولنے والی زبان کشمیری ہی ہے پھر بھی اہل کشمیر نے کسی بھی صورت میں اُردو کے تئیں اپنی بیگانگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہمارے اکثر و بیشتر قلمکار کشمیری کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس کے برعکس اگر اُردو کو برصغیر کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو پاکستان میں بھی، جہاں اسے قومی زبان کا درجہ حاصل ہے، انگریزی اور علاقائی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ اپنانے اور ترقی دینے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔اُردو کے مقابلہ میں پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو کی آباری ہو رہی ہے اور اُردو کو اب یوپی کے درآمدی لوگوں کی کی طرف سے پاکستان پر ٹھونسی گئی زبان کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔پاکستانی سینٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیئر پرسن رزینہ عالم نے حال ہی میں یعنی 5 رجنوری کو لاہور میں اس معاملہ پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی عوام اُردو زبان کے خلاف سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔انہوں نے کہا کہ ایک خاص طبقہ اُردو کی جگہ انگریزی کو ہماری قوم پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔[3]

ہندوستان کی بات تو پہلے ہی کی جا چکی ہے کہ بالخصوص شمال میں اس زبان کو تو اب اس حد تک نام نہاد سیکولر قوتیں بھی نیست و نابود کرنے پر تلی نظر آتی ہیں کہ حامد انصاری، سلمان خورشید اور غلام نبی آزاد بھی ہندی کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے میں

ہی اپنی خیریت پاتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو زبان کے ساتھ پر خلوص لگاؤ کے اظہار کی خاطر یہ ضروری ہے کہ سرکاری سطح پر ایک ایسی اُردو خبر رساں ایجنسی کا قیام عمل میں لایا جائے جو ناخواندہ مگر جاہ پسند وزراء اور سیاست دانوں کے گھسے پٹے بیانات کے برعکس ریاست میں ہونے والی ان سرگرمیوں کو باقاعدگی کے ساتھ مشتہر کرے جو ہماری ادبی ،ثقافتی ، ماحولیاتی ،سماجی اور اقتصادی زندگی میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔اس وقت اگر آپ دیکھیں تو ہمارے سیاست زدہ اُردو اخبارات ،ثقافت ،تاریخ یا سماجیات سے متعلق خبروں کی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

ریاستی سرکار بالخصوص محکمہ اطلاعات ایک ایسا خبر نامہ کم از کم ایک ہفت روزہ کی شکل میں شائع کرے جو ہزاروں کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوکر اُردو کے ذریعہ سرکاری کارکردگی اور ترقیاتی منصوبوں کی تفصیلات عام لوگوں تک پہنچاتا رہے۔

ریاستی کلچرل اکادمی کچھ سال قبل اکادمی کے نام سے ایک خبر نامہ باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتی تھی ، یہ جریدہ اب بے قاعدگی کے ساتھ کبھی کبھی نظر آتا ہے۔اسے ایک مستقل اور باقاعدہ خبر نامہ بنا کر دوبارہ پیش منظر میں لانے کی بھی ضرورتہ ے۔

قومی سطح پر اُردو سمیناروں، کانفرنسوں اور مناظروں کا احیاء پھر سے کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس سلسلہ میں بالخصوص کلچرل اکادمی کو وافر رقومات فراہم کی جائیں اور اکادمی کے اہلکار سال بھر کے لئے اس نوع کی سرگرمیوں کا ایک کلینڈر بنا کر اسے بروقت بروئے کار لائیں۔

جیسا کہ چند احباب تقاضا کرتے رہے ہیں کہ ریاست میں الگ سے ایک اُردو اکادمی قائم کی جائے ، میں ذاتی طور اس مطالبہ کے حق میں نہیں ہوں۔اُردو اکادمیاں ملک کی ان ریاستوں میں قائم ہے جہاں دوسری علاقائی زبانوں کے لئے بھی اسی قسم کے ادارے آزادانہ طور پر موجود ہیں لیکن ہماری ریاست میں ریاستی کلچرل اکادمی کم از کم دس زبانوں میں کام کرنے کی پابند ہے لہٰذا ایک الگ اُردو اکادمی کے قیام سے ایک الجھن اور

تذبذب کی حالت پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ اکادمی کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ ریاستی زبانوں میں ترجیحی طور پر ان زبانوں کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دے جن سے یہاں کے عوام کی بڑی سے بڑی تعداد مانوس ہے۔ ان زبانوں میں کشمیری، اُردو اور ڈوگری سرفہرست ہیں اور باقی زبانیں یا بولیاں اس کے بعد ہی عملی توجہ کی دعویدار ہو سکتی ہیں۔ اس بات پر تشویش کا اظہار کئے بنا نہیں رہا جا سکتا کہ گزشتہ دو تین سال کے دوران اکادمی کی طرف سے کشمیری کی طرف کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ اس کمی اور کوتاہی کو دور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

مرکزی اور ریاستی سطح پر ملک کے مختلف صوبوں میں جو اُردو اکادمیاں قائم کی گئی ہیں ان کے مالی ذرائع اس حد تک محدود ہیں کہ یہ غیر فعال ادارے اپنے عملہ کا مشاہرہ بھی بروقت اانہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ وہ اُردو زبان اور ادب کی سرگرمیوں کو موثر طور پر انجام دے سکیں، یو پی اور بہار کی اکادمیوں سے جو اُردو جرائد شائع کئے جاتے ہیں وہ کسی بھی صورت میں بروقت منظر عام پر نہیں آتے بلکہ جب بھی ان کا کوئی شمارہ کبھی کبھی سامنے آجاتا ہے تو وہ حکومت وقت کی چاپلوسی اور قصیدہ خوانی کے پھیکے اداریوں اور شذرات سے بھرا ہوتا ہے۔ ان جرائد کو مکمل طور پر باقاعدگی بخشنے کی غرض سے مرکزی سرکار کو ان کی اس حد تک مالی کفالت کرنی چاہئے جیسا کہ وہ ہندی اداروں کے لئے کرتی آتی ہے اور برابر کر رہی ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جہاں جموں وکشمیر جیسی چھوٹی سی ریاست کی کلچرل اکادمی کو کروڑوں روپے کا بجٹ دستیاب ہے وہاں یو پی جیسی ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کی اردو اکادمی کے لئے سرکاری مالی ذرائع صرف چند لاکھ روپے تک ہی محدود رکھے گئے ہیں۔

ملک کے سرکردہ اور مقتدر اُردو دانشوروں کو سرینگر اور جموں مدعو کر کے ان کے ساتھ تفصیلی نشستوں کا اہتمام کیا جائے تا کہ انہی کی زبانی ان کے کارناموں اور اُردو کے تئیں ان کی جو تجاویز کو سن کر مجموعی طور پر استفادہ کیا جائے۔ ایسی شخصیات میں گوپی چند نارنگ،

شمس الرحمٰن فاروقی، بشیر بدر، ندا فاضلی، قمر رئیس اور درجنوں ایسی ایسی شخصیات شامل ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی اُردو کی خدمت گذاری میں صرف کی ہے۔

ہماری ریاست میں جہاں اُردو ایک مشترکہ ورثے کی حیثیت رکھتی ہے اس زبان کو روز افزوں ترقی سے ہمکنار کرنے کی غرض سے خاص طور پر سرکاری سطح پر کئی اور ایسے اقدام کئے جاسکتے ہیں جن سے یہ سہمی ہوئی زبان کم از کم اس خطۂ ارضی میں اپنے آپ کو محفوظ تصور کرسکے۔



حوالہ جات

(1)- دی رول آف اِسلام اِن ساؤتھ ایشیاء، الفاتحہ فاؤنڈیشن پونے۔ 1990ء؛ ص: 15

(2)- اُردو ان جموں اینڈ کشمیر، نشاط انصاری، کاشر اورگ ویب سائٹ۔

(3)- ڈیلی ٹائمز، لاہور؛ 6رجنوری 2009ء۔



جنگ آزادیٔ ہند

اور کشمیری ادب کے رجحانات

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے 1857ء میں جب ہندوستان میں جنگ آزادی کی شروعات ہوئیں تو اس وقت کشمیر ایک الگ ملک تھا جس کا بھارت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس سے گیارہ سال پہلے یعنی 1846ء میں ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے سارا کشمیر انگریزوں سے پچھتّر لاکھ نانک شاہی روپوں کے عوض خریدا تھا اور اس سودا بازی میں کشمیر کی سرزمین کے ساتھ یہاں کے کھیت، پرندے، ندی نالے اور پہاڑ بھی گلاب سنگھ کی ملکیت بن چکے تھے۔ یہ معاہدہ 16 مارچ 1846ء کو امرتسر میں لکھا گیا اور اسے بیع نامۂ امرتسر کا نام دیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے اسے ''بکری پتر'' کہا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے ریاستی عوام کی غلامی کی دستاویز کہا۔ کشمیر کی تحریک حریت کے ایک سرکردہ سپاہی سردار بدھ سنگھ نے اس معاہدے کو دو ڈاکوؤں کے درمیان خرید و فروخت کا نام دیا۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اسے ''نیلامی کے مال کا سند نامہ'' کہا اور اُردو کے ایک مشہور دانشور اور صحافی مولانا غلام رسول مہرؔ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''1846ء میں انگریزوں نے کشمیر کو اس طرح فروخت کیا کہ امریکی آبادکاری کے ابتدائی دور میں حبشی غلام بھی شاید اس طرح بِکے ہوں''۔

علامہ اقبال نے بیع نامۂ امرتسر کے بارے میں کہا :

دہقان وکشت وجوے وخیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند ؟

کھیتی کرنے والے کو بیچا گیا، اس کے کھیت بیچے گئے، اس کا پانی اور اس کے باغ بیچے گئے۔ اس طرح سے ایک پوری قوم کو بیچا گیا اور کتنا سستا بیچا گیا؟

اگرچہ ظاہری طور پر بھارت اور کشمیر کے عملی طور پر ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے جنگِ آزادی میں ان دونوں علاقوں کا ایک دوسرے کیساتھ براہ راست رشتہ نہیں رہا لیکن کئی حضرات کو شاید یہ معلوم نہیں ہوگا کہ جب اس جنگ کے اثرات مری اور ہزارہ کے جنوبی علاقوں تک پہنچ گئے تو وہاں عباسی لیڈر سردار شیر باز خان نے انگریزوں پر یلغار کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اس نے جن بارسوخ قبائلی سرداروں کی حمایت حاصل کرنے کی پہل کی اُن میں جموں وکشمیر کے پونچھ صوبے کا سردار ریشم خان بھی شامل تھا۔

یہ قدم بہرحال کامیاب نہیں ہوسکا۔ شیر باز خان کے آٹھوں کے آٹھ بیٹے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیئے گئے۔ سردار کو بھی پھانسی پر لٹکایا گیا اور اس انگریز مخالف کوشش میں شامل سبھی قبائل رہنما بھی انگریزوں کے ہاتھوں شہید کیئے گئے۔

1857ء کو جس آزادی کی لڑائی کی بنیاد پڑی وہ اگرچہ ہندوستانیوں کو نوے سال بعد ہی نصیب ہوئی لیکن اس جنگ میں آزادی کے بے شمار مجاہد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ان کا تعلق ملک کے سبھی حصوں کے ساتھ تھا جن میں کشمیر بھی شامل ہے۔ برطانوی سامراج نے اس لڑائی کا گلا گھونٹنے کی غرض سے ہر طرح کی طاقت استعمال کی کیونکہ اُس کے پاس طرح طرح کے ہتھیار اور زور آزمائی کے وسائل تھے جبکہ دوسری طرف نہتے لوگ خالی ہاتھوں سے یہ جنگ لڑنے کے لئے میدان میں اُترے تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس جنگ میں ملک کے چند اقتدار پرست شہزادوں اور راجوں نے انگریز کا ساتھ دے کر غدّاری کی بدترین مثال قائم کرلی۔ اُردو کے عظیم شاعر مرزا غالب نے اُس وقت کے ظلم

وستم کے بارے میں لکھا ہے کہ ''میری نظروں کے سامنے خون کے دریا بہہ رہے ہیں'' اور غالب پھراس عالم دہشت گردی کے بارے میں کہتا ہے کہ کس طرح فتح مند فوج نے ہر ایک کو قتل کرنا شروع کیا جو بھی اُس کی نظروں میں آیا اسے تہہ تیغ کر دیا اور شہریوں کے مال وجائیداد کو بے تحاشہ لوٹ لیا گیا۔

بہادر شاہ ظفر کے تین شہزادے دہلی کے خونی دروازے پر پھانسی پر لٹکائے گئے۔خود بہادر شاہ کی آنکھیں نکالی گئیں اور اسے رنگون جلاوطن کیا گیا جہاں وہ بے بسی کے دن اور بے چارگی کی راتیں کاٹتے کاٹتے 1862ء میں انتقال کر گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں کے سامنے سرخم کرنے اور اپنی جان بچانے پر اپنی وطن پرستی کو ترجیح دی اور یہ پیشینگوئی کر کے اپنے دیش کی خاطر اپنی جان قربان کی کہ ''ہندوستان کی طاقت ایک دن لندن کو ہلا کے رکھ دے گی''۔

یہ وہی بہادر شاہ ظفر ہیں جن کے تخت کو بچانے کی خاطر لاتعداد ہندوؤں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور شاہ نے ان جذبات کے احترام میں ذبیحہ گائے کو ممنوع قرار دیا۔ظفر ایک صوفی منش شاعر اور خدادوست بزرگ بادشاہ تھا جس نے اپنے اشعار میں ہندو مندروں میں حاضری دینے، پیشانی پر تلک لگانے اور زُنار باندھنے کا ذکر کیا ہے۔

کشمیر میں قدیم زمانے میں اور اس کے بعد بھی ادب کے شعبے میں جو کمال کشمیری ادیب اور شاعر دکھاتے رہے ان کا ریکارڈ اس لئے محفوظ نہیں رہ سکا کہ کشمیر اُس سارے زمانے میں بیرونی حاکموں کے قبضے میں رہا جنہوں نے کشمیری ادب، فن، تاریخ اور ثقافت کو بڑھاوا دینے کے برعکس اپنے لئے عیش وآرام کی زندگی کو ضروری سمجھا۔ لیکن اس ناخوشگوار اور گھٹے گھٹے ماحول میں بھی کشمیر کے قلم کاروں نے اپنے شعور اور فن کی مشعل کو بجھنے نہ دیا۔

کشمیر کے مختلف راجا اور حاکم اگر چہ لوگوں کو طرح طرح سے ستاتے رہے اور ان کی آزادی کی آواز کو دباتے رہے پھر بھی کشمیریوں نے اپنے حاکموں کی مرضی کیخلاف حب

الوطنی اور سیکولرازم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ انسانی قدریں ان کی تخلیقات میں الگ الگ رنگوں میں آشکارا ہوتی رہیں اور اس ہمیشہ رہنے والی انسان دوستی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کی خوشبو برابر آج بھی کشمیری شاعری کے انگ انگ سے پھوٹتی ہے۔

کشمیر میں چودھویں صدی عیسوی میں جو شاعری لکھی گئی اور جو ہمارے پاس موجود اور محفوظ ہے اس کی بنیاد بھی کشمیری شیوازم اور ریشی مت اور صوفی ازم یا تصوف پر رکھی گئی ہے۔ اس انسانی فلسفہ کے دو اہم مبلغ کشمیری زبان کی پہلی شاعرہ لل ایشوری یا للہ عارفہ اور شیخ نورالدین نورانی تھے۔ ان دونوں نے اپنے کلام میں خدا یا بھگوان کو اپنے ہی من میں تلاش کرنے اور وہیں پر اُس کے درشن کرنے کی تاکید کی ہے۔ انہوں نے یہ پیغام چار سو پھیلایا کہ نفس اور خواہشات پر قابو پانا ہی انسانیت کی قدر و قیمت کو بڑھاوا دیتا ہے اور انسان خواہ کتنا ہی آسودہ حال یا کسی بھی مذہب کا پیروکار ہو آخر اسے یہاں سے وہی نیکیاں اور بدیاں لے کر جانا ہے جو اس نے دُنیا میں کی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ سدا بہار فلسفۂ زندگی سات سو سال گذرنے کے بعد آج بھی تر و تازہ ہے اور ہمارے دلوں کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔

للہ عارفہ کے کلام کا نمونہ پیش ہے:

میں کچے دھاگے سے اپنی کشتی کو کھے رہی ہوں
کیا میرا شو سنے گا اور مجھے پار لگائے گا

میرے ساتھ ایسا ہوا جیسے مٹی کے کچے برتنوں میں پانی جذب ہوا ہو میرا دل گھبرا رہا ہے اور میں گھر لوٹنا چاہتی ہوں۔

میں نے نبات کا بوجھ اٹھایا تو اس کی رسی ڈھیلی پڑ گئی
بدقسمتی سے میرا کام ہونے سے پہلے ہی بگڑ گیا
میرے گورو نے جو مجھ سے کہا وہ میرے دل پر ایک چوٹ لگی
میرا ریوڑ چرواہے کے بغیر راستوں میں کھو کے رہ گیا

اور شیخ نورالدین نے کہا:

اس دنیا میں بہت کھیلے ہم
اور اس کھیل میں ہم نے سب کچھ بھلا دیا
یہاں کیا مسلمان اور کیا ہندو
سبھی کو کھیل کر واپس آخرت کے گھر جانا ہے



میں ان پانچ کو دس کو اور گیارہ کو کیا کروں
جو سب اس برتن میں انگلیاں ڈال ڈال کے چلے گئے
کاش سبھی مل جل کر ایک ہی رسّی پکڑ لیتے
پھر اُن کی نظروں کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں ہو جاتی

ہند میں آزادی کی پرامن لڑائی کے ایک سو سال کے دوران بھی کشمیری غلامی کے اندھیرے میں بھٹک رہا تھا۔ سولہویں صدی عیسویں میں اسے پہلے مغلوں نے اپنے قبضے میں لاکر اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنالیا۔ پھر قابض پٹھانوں اور سکھوں کے بدترین دور حکومت کے بعد ڈوگروں کے شخصی راج میں پوری ایک صدی تک کشمیریوں کو ہر قسم کا ظلم ستم اور استیصال سہنا پڑا۔

یہاں یہ بات اطمینان کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں جنگ آزادی جن جن مرحلوں سے گذرتی رہی اور جو جو مرحلے اس نے طے کئے ان سے کشمیر کی آزادی کی جنگ بھی ایک یا دوسرے طریقے سے متاثر ہوتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک میں کویٹ انڈیا یا بھارت چھوڑ دو کی تحریک مہاتما گاندھی کی تاریخ ساز رہبری میں شروع ہوئی تو کشمیر کے لوگوں نے بھی شیخ محمد عبداللہ کی رہنمائی میں کویٹ کشمیر کی تحریک شروع کی جس کا نعرہ تھا۔ بیعنامہ امرتسر کو توڑ دو۔ کشمیر کو چھوڑ دو۔ مئی 1946ء میں جب کشمیر میں اس زوردار تحریک کا چرچا ہر طرف ہوا اور شیخ صاحب کو مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ نے قید خانے میں

ڈال دیا تو پنڈت جواہر لال نہرو بذات خود شیخ عبداللہ کی وکالت کرنے کے لئے کشمیر چلے آئے جہاں مہاراجہ نے انہیں کشمیر کی مغربی سرحد کے قریب ہی روک لیا۔

1947ء میں کشمیر پر قبائلی حملے کے دوران کشمیری ادب کا ایک قسم کا Renaissance سامنے آیا جب کشمیری شاعروں نے پہلی بار اپنی پوری فنی طاقت کو کام میں لا کر وطن پرستی، دیش کی حفاظت اور کشمیریوں کی غیرت اور آزادی پسندی کے انقلابی نغمے گائے۔ اس حملے کو ناکام بنانے میں بھارت نے چونکہ کشمیریوں کو اپنی فوجی امداد بھی پیش کی تھی جس پر فخر کرتے ہوئے پریم ناتھ پردیسی نے لکھا:

قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے
لڑیں گے ہم لٹیروں اور حملہ آوروں کے ساتھ
لڑیں گے ظالموں کے ساتھ اور جابروں کے ساتھ
وطن فروش، بے وفاؤں اور شاطروں کے ساتھ
قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم
سوال اب نہیں رہا کسی کی خاص ذات کا
یہ مسئلہ نہیں ہے ایک دو یا پان سات کا
سوال یہ ہے قوم کی حیات کا ممات کا
قدم قدم بڑھیں گے ہم محاذ پر لڑیں گے ہم

اور مخدوم محی الدین نے جو اُن دنوں اکثر کشمیر آ کر یہاں کے حالات کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے تھے، دشمن کو یہ کہہ کر للکارا:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی، آزادی کے پرچم تلے
جموں و کشمیر ہمارا ہے، پورب پچھّم دکھن اُتر
ہم لداخی ہم کشمیری، ہم جموی جانبازانِ وطن

ہم سرخ سپاہی ظلم شکن ، آہن پیکر فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگ آزادی

اس سے پہلے کشمیری کے شاعر انقلاب عبدالاحد آزاد نے سارے ہندوستان کو اپنا ملک اور اپنا گھر جتلا کر کئی بار ایسے رہنماؤں کے ساتھ اختلاف بھی کیا جو آزاد کے خیال میں کسی مرحلے پر غلط راستے پر چلے تھے۔ سبھاش چندر بوس کے ساتھ آزاد کے اختلاف کا یہ سبب تھا کہ بقول آزاد سبھاش چندر بوس جاپانیوں کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ آزاد کی رائے یہ تھی کہ اگر ملک کو آزاد کرانا ہے تو وہ اپنے زورِ قوت سے کرانا ہوگا اور اس میں کسی دوسرے کے بازوؤں کا سہارا لینا غیر مناسب ہوگا۔ وہ کہتے ہیں:

کران گرداب کتھ پانس انان ادہ گیور طوفانس

شرف یُس صاحب خانس تہ سُے چھاپر زنن اندر

گرداب یعنی بھنورا اپنے ہی ارد گرد ناچتا ہے اور پھر طوفان کو زیر کرتا ہے۔ ایک گھر کے مالک کو جو عزت اپنے گھر میں حاصل ہوتی ہے وہ کرائے کے مکان میں رہ کر کیسے حاصل ہوگی؟

اس سے پہلے آزاد کے بزرگ ہم عصر شاعرِ کشمیر غلام احمد مہجور نے کشمیری شاعری میں جدیدیت یعنی Modernism کو بڑھاوا دیا اور اس نے اپنے کلام میں جن مضامین کو پہلی بار خوبصورتی کے ساتھ چھیڑا ان میں کشمیر جیسے خوبصورت خطے کی تعریف، غلامی کے خلاف انسان کے جذبات کا شدید اظہار اور آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی ایک عام انسان کا بدترین زندگی گزارنے پر مجبور ہونا شامل ہیں۔

مہجور کے بارے میں یہ روایت ہے کہ جب مہاکوی رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کی چند غزلوں کا انگریزی ترجمہ سنا تو کہا ''اگر مہجور بنگالی بھاشا جانتے تو میں ضرور کہتا کہ اُس نے میرے خیالات اپنائے ہیں''۔

کشمیری ادب میں اگرچہ پچھلے ساٹھ ستر سال میں کئی نئے نئے تجربے ہوئے ہیں

جن کی وجہ سے اس میں شاعری کے علاوہ ڈراما، ناول، مثنوی، کلاسیکی شہہ پاروں کے ترجمے، سفر نامے اور طنز و مزاح کا بہت بڑا خزانہ شامل ہوا لیکن اس وقت بھی جو حالات کشمیر میں ہیں اور جنہوں نے پچھلے تقریباً بیس سال سے اس فردوس ارضی کو جہنم میں تبدیل کرلیا ہے اسے نظر میں رکھتے ہوئے کشمیر کا ہر شاعر اور دانش ور اپنی شاعری کے ذریعہ بار بار خدا کے سامنے یہ التجا کرتا نظر آتا ہے کہ کشمیر میں امن وسکون، ترقی اور خوشحالی کی بہار ایک بار پھر کھِل اُٹھے اور ہندوستان کے سر کا یہ تاج پھر سے اُسی طرح چمک اٹھے جس طرح یہ صرف بیس سال قبل سارے ملک کی شکل وصورت کو اپنی روشنی سے نہ صرف چمکا رہا تھا بلکہ اسے ایک فطری آسودگی، انسانی قدروں کی سربلندی اور کشمیریت کے آئینے میں چمکتی ہوئی انسانیت سے سرشار کر رہا تھا۔



احمد ندیم قاسمی....

چند تاثرات

آزادی کے بعد جن اُردو شعراء کے کلام سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا اُن میں فیض احمد فیضؔ ایک مقدم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اثر پذیری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ 1958ء سے لے کر 1960ء تک سنٹرل جیل سرینگر میں میری نظر بندی کے دوران میں نے فیض صاحب کا بھرپور مطالعہ کیا جو پاکستان میں آمرانہ حکومتوں کے ہاتھوں ایک فرضی مقدمے میں ملوث ہو کر خود بھی قید و بند کی صعوبتیں اٹھا چکے تھے اور جیل میں انہوں نے جو عظیم سرمایہ اُردو شاعری کو عطا کیا وہ آج بھی بیش بہا ہے۔

فیض صاحب کے بعد احمد ندیم قاسمی برصغیر میں ایک محبوب اُردو قلمکار کی شکل میں میرے دل و دماغ پر حاوی ہو گئے اور اس فکری غلبے کو ان ملاقاتوں کے دوران مزید تقویت ملی جو مجھے لاہور میں قاسمی صاحب کے ساتھ نصیب ہوئیں۔ قاسمی صاحب 10 جولائی 2006ء کو تقریباً نوے سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے اور اس طرح کئی نسلوں کے دل و دماغ پر راج کرنے والی اور برصغیر کی ادبی دنیا میں ایک شہسوار کی طرح براجمان ہونے والی شخصیت کی مدھر آواز خاموش ہو گئی۔

جولائی 2006ء میں پاکستانی ٹیلی ویژن نے احمد ندیم قاسمی کی زندگی میں ہی نشر کیا ہوا ان کے تئیں خراج تحسین نام کا ایک جامع پروگرام پیش کیا جس میں امجد اسلام امجد، گلزار، سردار جعفری، عطاالحق قاسمی، اسلم کمال، خالد احمد، منور سید، منشا یاد، اشفاق احمد، حفیظ

تائب اور بانو قدسیہ نے قاسمی صاحب کو اپنے اپنے انداز میں خراج تحسین پیش کیا اور قاسمی صاحب اپنی دھیمی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے تعظیم و عقیدت کے یہ پھول اپنے دامن میں سمیٹتے رہے۔ یہ پروگرام بھی قاسمی صاحب کے ساتھ میرے مراسم کے واقعات کو قلم بند کرنے کا محرک بن گیا۔

احمد ندیم قاسمی کے ساتھ میری پہلی ملاقات جنوری 1990ء میں لاہور میں اُن کے ادبی کام کاج کے دفتر مجلس ترقی ادب لاہور میں ہوئی جس کا اہتمام میرے بہت ہی پیارے دوست کشمیر نژاد مرحوم کلیم اختر نے کیا تھا۔ کلیم اختر اس وقت روزنامہ ''مشرق'' کے ساتھ وابستہ تھے اور وہ کئی اخباروں میں ادبی اور سیاسی مضامین باقاعدگی کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔

جب ہم کلب روڈ پر واقع قاسمی صاحب کے دفتر میں پہنچے تو وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں کتابوں کے ایک انبار میں گویا اپنے آپ کو ڈبو کر کام میں لگے تھے۔ انہوں نے سدابہار تبسم کے ساتھ میرا استقبال کیا اور ساتھ ہی بیٹھی ان کی صاحبزادی منصورہ احمد نے والہانہ خوش آمدید کے پھول ہم پر نچھاور کئے۔ قاسمی صاحب کی بغل میں دفتر کے کونے میں پڑی ایک کرسی پر قتیل شفائی پہلے ہی سے براجمان تھے۔ انہوں نے جب یہ سنا کہ میں بھارتی کشمیر سے آیا ہوں تو انہوں نے اپنے خاص پٹھانی انداز میں مجھے گلے لگا کر اپنی محبت اور شفقت کا مظاہرہ کیا۔ یہ محفل دیر تک چلی اور زیادہ تر گفتگو کشمیر کے مسئلے کے گرد ہی گھومتی رہی۔ قتیل صاحب نے فخریہ لہجے میں کہا کہ تیس چالیس سال قبل جو نظم انہوں نے آزادئ کشمیر کے حق میں لکھی تھی وہ شعری تخلیق اب بھی انہیں بے حد پیاری ہے۔

خوش رو منصورہ احمد نے، جو خود بھی اُردو کی شاعرہ ہیں، مجھے قاسمی صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے معتبر جریدے ''فنون'' کے ایک دو شمارے پیش کئے اور یہ اصرار کیا کہ میں کشمیر سے اس رسالے کے لئے اپنی کوئی تحریر ضرور ارسال کروں۔ اس ملاقات کا اختتام ایک گروپ فوٹو پر ہوا جس میں احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، کلیم اختر اور میں شامل

ہیں اور جو آج بھی میرے ذاتی تصویر خانے کی زیب و زینت ہے۔

اس ملاقات کے دوران جب میں نے قاسمی صاحب سے پاکستان میں اُردو ادب کے حوالے سے چند سوالات کئے تو انہوں نے جواباً کہا کہ پاکستان میں ادب کو کسی بھی فہرست کے اخیر پر ہی رکھا جاتا ہے جیسا کہ ہندوستان میں بھی اردو کے ساتھ ہو رہا ہے۔

قاسمی صاحب میں میں نے ایک خاص صفت موجود پائی کہ وہ برصغیر کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود کسی دوسرے پر اپنے آپ کو Impose نہیں کرتے بلکہ وہ دوسروں کو گوش بر آواز ہو کر سنتے اور انہیں یہ احساس دلاتے کہ آپ خود بھی کسی سے کمتر نہیں۔ آج کل ہمارے بزرگ ادیبوں اور شاعرں میں یہ انسانی وصف ناپید ہے۔

اس کے بعد قاسمی صاحب سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ ہر بار مجھے ایسی لطیف حکایات اور میٹھی باتیں سناتے رہے جن سے مجھے ہمیشہ ان کے ساتھ ایک فطری والہانہ پن کا بار بار احساس ہوتا رہا۔

20 رنومبر 1997ء کو جب میں احمد ندیم قاسمی کو کوئی اطلاع دیئے بغیر ان کے دفتر میں گھس گیا تو ان کے کشادہ چہرے پر وہی مسکراہٹ اور تازگی پھیل گئی جس کا وہ ایک پیکر تھے۔ کمرے میں چند لوگ مٹھائیاں بانٹ رہے تھے اور معلوم ہوا کہ اس دن قاسمی صاحب کی اکیاسویں (81ویں) سالگرہ تھی۔ وہ خود اس شادمانی سے بے خبر اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے لیکن وقفے وقفے کے ساتھ اپنی پروقار مسکراہٹ کے ساتھ اپنے احباب اور قدردانوں کی طرف حوصلہ افزا نگاہیں بھی ڈالتے تھے۔

اس ملاقات کے دوران میں نے ان سے یہ گذارش کی کہ اُردو میں میری ایک ضخیم کتاب ''کاروانِ خیال'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ وہ اس کا دیباچہ تحریر کرنے کی زحمت کریں۔ انہوں نے اس کتاب کے مندرجات کے بارے میں دریافت کیا اور جب میں نے ان سے کہا کہ اس میں کشمیر کے ادب، ثقافت اور دیگر ادبی موضوعات کے بارے میں میرے مقالے شامل ہیں تو انہوں نے فوراً ہاں کر دی

اور اگلے ہفتے ایک مختصر سا پیش لفظ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میرا یہ یقین ہے کہ میری اس ضخیم کتاب، جو چار سو چالیس صفحات پر مشتمل ہو کر 1998ء میں شائع ہوئی، کے لئے کوئی اور صاحب قلم قاسمی صاحب سے زیادہ خوبصورت پیش لفظ نہیں سکھ سکتا۔ یہ مختصر سا دیباچہ یوں ہے:

> ''غلام نبی خیالؔ کی اس تصنیف ''کاروان خیال'' کی مثال ایک چمن زار کی ہے جس میں ان تمام رنگوں کے پھول کھل رہے ہیں جواب تک انسانی بصارت کے دائرے میں آئے ہیں۔
>
> کشمیری ادب وفن کے خوشبو سے لدے ہوئے گلابوں سے لے کر علامہ اقبالؔ کے حد نظر تک پھیلتے لالہ زاروں تک اس چمن زار کی حدود آفاق گیر ہیں۔
>
> موضوع کی یکسانیت سے بعض دفعہ جو اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے اس سے یہ کتاب کلیتہً مبرا ہے۔ موضوعات کے تنوع نے خیال صاحب کی اس خوبصورت تخلیق کو ایسی بوقلمونی عطا کی ہے کہ قاری کے دل اور دماغ کو اس کتاب کی رنگارنگی پے درپے روشنیوں سے منور کرتی چلی جائے گی اور وہ جب اپنا مطالعہ مکمل کر چکے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کے وجدان وادراک تازہ ہوا کے جھونکوں سے لہلہا اٹھے ہیں''۔

اس کے بعد قاسمی صاحب نے میرے کہے بغیر اور اپنی مرضی سے ''فنون'' کے اپریل جولائی 1999ء کے شمارے میں ''کاروان خیال'' پر یہ مختصر مگر معنی خیز تبصرہ لکھ کر شائع کیا:

> ''غلام نبی خیالؔ کی اس کتاب کا پینوراما اتنا وسیع ہے کہ اُفق تا اُفق پھیلا لگتا ہے۔ پہلے حصے میں کشمیری ادب وثقافت پر تیرہ مضامین شامل ہیں جن کی اہمیت اور افادیت عنوانات سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ کشمیری

ادب کا جائزہ، اکہ ننڈُن، کشمیر کی مشہور لوک کہانی، للہ عارفہ اور شیخ العالم، کشمیری زبان کی بزمیہ مثنویاں، محمود گامی کشمیر کا نظامی، کشمیری ادب میں دیگر زبانوں کے تراجم، کشمیری شاعری پر غالب کا اثر، کشمیری جنگ نامے، کشمیری رزمیہ اور سام نامہ، کشمیر، وسط ایشیائی اور روسی ادب، کشمیری زبان کی شاعرات، کشمیری صحافت، کشمیری شاعری پر تحریک آزادی کے اثرات، یوں سمجھئے کہ پورے کشمیری ادب کا ایک تجزیہ، ایک محاکمہ اس بابِ اوّل میں درج ہے۔

دوسرا باب متفرقات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی بڑے پایے کے مضامین جمع ہیں۔ مثلاً غنی کشمیری کے سوانح اور شخصیت پر ایک نہایت عمدہ مضمون، اقبال، حافظ اور گوئٹے کا سلسلۂ محسوسات، یوری پیڈیز، ارسطو اور فن شاعری، رباعیات عمر خیام پر ایک نظر اور اس باب میں شامل سفر نامہ عراق بھی بے حد معلومات افزاء ہیں۔

تیسرے یعنی آخری باب میں مشاہیر کے خطوط (غلام نبی خیال کے نام) درج ہیں۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ پریم ناتھ بزاز، سہیل عظیم آبادی، لارڈ برٹرینڈ رسل، امتیاز علی عرشی، شاذ تمکنت، رام لعل، ڈاکٹر رادھا کرشنن، شمس الرحمان فاروقی، شیخ محمد عبداللہ، بلراج ساہنی، دیو آنند، راج کپور، رامانند ساگر، آل احمد سرور، فکر تونسوی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبدالحق، اشفاق احمد، واجدہ تبسم، ہاشم رضا، جگن ناتھ آزاد، طاؤس بانہالی، ڈاکٹر سید عابد حسین وغیرہ۔

ان ابواب کے عنوان پر ہی ایک سرسری نظر ڈالنے سے ''کاروان خیال'' کی اہمیت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے بارے میں ایک بار لکھا تھا کہ ''غلام نبی خیال کی اس تصنیف

کی مثال ایک چمن زار کی ہے جس میں ان تمام رنگوں کے پھول کھل
رہے ہیں جو اب تک انسانی بصارت کے دائرے میں آئے ہیں''۔

میں قبل از آزادی سے لے کر آج تک کشمیر کے حوالے سے اُردو میں تخلیق کی گئی مزاحمتی شاعری کا ایک مجموعہ ''فغانِ کشمیر'' کے نام سے مرتب کر رہا تھا۔اس سلسلے میں میں نے قاسمی صاحب کو بھی خط لکھا تھا کیونکہ میں نے سنا تھا کہ انہوں نے کشمیر کے موضوع پر بے حد خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ان کا جواب فوراً ہی آ گیا جس میں انہوں نے نظمیں ارسال کرنے کا وعدہ کر لیا:

''مجلس ترقی ادب

1۔کلب روڈ، لاہور پاکستان

محترم و مکرم خیال صاحب......سلام مسنون

گرامی نامے مل گئے تھے۔

کشمیر کے بارے میں اپنی نظمیں آج ہی ایک صاحب کے حوالے کی ہیں۔دراصل میں گاؤں چلا گیا تھا۔وہاں علیل ہو گیا اسی لئے تاخیر کا مرتکب ہوا۔معذرت خواہ ہوں۔اب انشاء اللہ تین نظمیں آپ تک پہنچ جائیں گی۔ ایک چوتھی نظم بھی کوشاں ہوں کہ وہ بھی دستیاب ہو جائے۔

دعا ہے کہ آپ خیریت سے ہوں۔''

قاسمی صاحب نے کشمیر پر جو تین نظمیں فوراً ہی مرحمت فرمائیں وہ ''فغانِ کشمیر'' میں شامل ہیں۔یہاں پر ان میں سے چیدہ چیدہ اشعار کو نقل کرنا موضوع کے تعلق سے مناسب رہے گا۔ان منظومات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جہاں 1947ء سے قبل کے غلام کشمیر کی ترجمان ہیں وہاں ان میں آج کے کشمیر کے کوائف اور حالات کی برمحل عکاسی بھی پائی جاتی ہے۔یہی ایک عظیم فنکار کے کمالِ فن کا ثبوت ہے۔ان نظموں کے عنوانات بالترتیب کشمیر، وقفہ اور کارواں بہاروں کا ہیں۔ان میں سے یہ منتخب اشعار ملاحظہ کریں:

ہونٹوں پہ رکھے ہوئے ہیں شعلے
آنکھوں میں جمی ہوئی جلن ہے
حق بات تو خیر جرم تھا ہی
حق مانگنا بھی دِوانہ پن ہے
کشمیر کی مفلسی میں لیکن
اب کیسا بلا کا بانکپن ہے
زخموں سے اٹے ہوئے بدن پر
یزداں کا جلال ضوفگن ہے
ہر دل میں گڑا ہوا ہے تیشہ
لیکن یہی عشق کا چلن ہے
جو موت ہو زندگی کی خاطر
وہ زندگی کا کمالِ فن ہے

(کشمیر)

راستہ نہیں ملتا منجمد اندھیرے میں
پھر بھی باوقار انسان اس یقیں پہ زندہ ہے
برف کے پگھلنے میں پو پھٹے کا وقفہ ہے
اس کے بعد سورج کو کون روک سکتا ہے؟

(وقفہ)

فضا سے ابر برستا رہا شراروں کا
مگر رواں ہی رہا کارواں بہاروں کا
وہیں سے پھوٹ رہا ہے طلوعِ صبح کا نور
جہاں شہید ہوا اک ہجوم تاروں کا

مجھے تو پھول کھلانا ہیں وہ لہو کے سہی
مجھے تو قرض چکانا ہے شاخساروں کا
یہ جی میں ہے کہ شہیدوں کی طرح زندہ رہوں
میں اپنے فن کو بنالوں دیا مزاروں کا

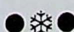
(کارواں بہاروں کا)

قاسمی صاحب کے تئیں اپنی عقیدت کے نتیجے میں میں نے ان کی ایک مشہور نظم کا منظوم کشمیری ترجمہ کیا جو "1951ء کا شعری ادب" کے عنوان سے شائع ہوئے مجموعے میں شامل تھی اور جس کا موضوع جنگ کی تباہ کاروں سے متعلق تھا۔ میرا ترجمہ میری کشمیری شاعری کے مجموعہ "الہام" میں شامل کتاب ہے۔

22 ستمبر 1997ء کو جب مجھے قاسمی صاحب کی معیت میں اُن کے دفتر پر بیٹھے ہوئے گھنٹے گذر چکے تھے۔ میں نے ان سے رخصت چاہی وہ کھڑے ہو کر پھر ایک بار مجھے گلے ملے اور اپنی بیٹی منصوؔرہ سے کہا کہ "میری کتابیں خیال صاحب کی نذر کرو"۔ قاسمی صاحب نے اپنا مجموعۂ کلام "بسیط" اور افسانوں کا مجموعہ "کوہ پیا" مجھے عنایت کئے اور ان پر اپنے ہاتھ سے یہ تحریر کیا "عزیزم غلام نبی خیال کی نذر"۔ یہ مشفقانہ تحریر میرے لئے ایک تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔

بابا احمد ندیم قاسمی کے ساتھ وہ میری آخری ملاقات تھی۔ ان کے بارے میں بہر حال یہی کہا جاسکتا ہے:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما



میر غلام رسول نازکی کی رباعیات

رُباعی شاعری کے اصناف میں ایک مشکل ترین صنف ہے جس میں اظہارِ خیال کی برجستگی کے لئے شاعر کو فنی باریک بینی اور شاعرانہ کمال فن سے کما حقہٗ واقف ہونا چاہئے۔ ایک مختصر بحر کے چار مصرعوں پر مشتمل یہ صنف سخن ایک ہی رباعی میں ایک ایسے جہانِ معنی کو سمو دینے کا تقاضا کرتی ہے جس کا خیال کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ایک طویل نظم میں کیا جاسکتا ہے لیکن رباعی میں مصرعوں کی پابندی اور وزن کی تنگ دامنی کے باوجود جو سخن گو اس میدان میں کامیاب تجربے کا حوصلہ رکھتے ہوں وہی اس تنگ دامن مگر بے حد اثر کن شاعری کے زمرے میں اپنی فنی مہارت اور فکری نزاکت کے جلوے دکھاتے ہیں۔

سیّد سلیمان ندوی نے رُباعی کے مقبول عام وزن کی دریافت کے بارے میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ''اہل ادب اور اہل تذکرہ جن کا خیال ہے کہ رباعی اتفاقیہ ایجاد کا نتیجہ ہے اس کے متعلق ایک قصہ بیان کرتے ہیں کہ غزنین یا سجستان کے کسی شہر میں چند لڑکے گولی کھیل رہے تھے۔ ایک گولی لڑھکتی ہوئی سوراخ کے پاس آئی اس پر خوشی کے عالم میں ایک لڑکے کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

غلتان غلتان ہمے رود تا بن کو

اتفاق سے کوئی صاحب ذوق وہاں کھڑا تھا۔ اس کو یہ وزن بہت پسند آیا۔ اس نے اس کا وزنِ عروضی دریافت کیا اور پھر وہ شعراء میں مقبول ہو کر رواج پذیر ہو گیا۔

''تذکرۂ دولت شاہ (تالیف 892ھ) میں مذکور ہے کہ یہ بچہ صفارؔیہ خاندان کے بانی یعقوب صفاری المتوفی 625ھ کا لڑکا تھا اور وہ صاحب ذوق خود یعقوب صفار تھا جو

کھڑا اپنے بچے کا تماشہ دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً بچے کی زبان سے یہ برجستہ مصرعہ نکلا۔ یعقوب کو یہ وزن بہت پسند آیا لیکن چونکہ اس وقت تک یہ وزن شعراء میں مستعمل نہیں تھا اس لئے اُس نے ابودلف عجلی اور ابن الکعب کو جو دربار کے شعراء تھے بلوا کر پوچھا کہ یہ کون سی بحر ہے۔ انہوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ یہ بحر ہزج کی ایک قسم ہے اور اس پر اسی وزن کے تین اور مصرے لگا کر دوشعر پورے کر دیئے اور دوبیتی اس کا نام رکھا‘‘۔(1)

چونکہ ندوی نے اس واقعہ کے محل وقوع کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن گمان اغلب ہے کہ یہ عربستان کے برعکس عجم میں رونما ہوا ہوگا کیونکہ بچے کے منہ سے جو مصرعہ نکلا وہ عربی میں بلکہ فارسی زبان میں ہے۔

رُباعی کے لئے جوئی اوزان مقرر کیئے گئے ہیں ان سبھی کے لئے کشمیری زبان کی شاعرانہ دنیا اجنبی سی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیری شاعری کا اکثر و بیشتر حصہ یہاں کے مقامی رنگ میں ڈھل کر لوک رنگ کے گیتوں اور نغموں سے آباد ہے۔

ہمارے یہاں جن شعراء نے رباعی کے عام بحر لاحول ولاقوۃ الا باللہ میں طبع آزمائی کی بھی ہے وہ اس مختصر سے سلسلے کو ترسیل کے خوبصورت اظہار کا جامہ پہنانے میں ناکام ہی رہے ہیں۔ بعد میں اس صورتحال کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا تو میر غلام رسول نازکی نے ایک قابل قبول اور آسان بحر میں رباعیات لکھنے کا آغاز کیا۔ اس میں وہ اس طرح سے کامیاب ہوئے کہ آج نازکی صاحب کی کشمیری رباعیات اپنے معیار، حسن اسلوب اور معنی آفرینی کی بدولت ان کے اُس سارے اُردو کلام پر حاوی ہیں جو انہوں نے 1953ء تک موزون کیا۔

اپنی رباعیات کے اولین مجموعہ ’’نمرُود نامہ‘‘ کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ ’’اگست 1953ء تک میں نے کبھی کشمیری شاعری نہیں کی ہے۔ میں اُردو میں لکھتا تھا۔ اگست 1955ء میں مشاعروں اور کنونشنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے سرکاری حیثیت میں ان میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ ان مشاعروں میں اگرچہ چند خوش کلام کشمیری

شاعر بھی اپنا کلام سناتے تھے۔ مگر اکثر ایسے تھے جو معلوم نہیں کیا کہتے تھے اور جسے انہوں نے شاعری کا نام دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی خودساختہ شاعروں نے مجھے کشمیری میں شاعری کرنے کی طرف مائل کیا"۔(2)

اور آگے چل کر علامہ اقبال سے متاثر ہونے کے بارے میں اعتراف کرتے ہیں کہ "میری شاعری میں اکثر خیالات حضرت اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے ہیں جن کا میں نے یا تو ترجمہ کیا ہے یا ان سے استفادہ کیا ہے۔ میں اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ خود کریں"۔(3)

میر غلام رسول نازکی نے ہم عصر کشمیر کے جن سیاسی ادوار میں اپنا روئے سخن اُردو سے کشمیری کی طرف مبذول کیا وہ سبھی پرآشوب، ہنگامہ خیز اور ایک باشعور سخن ور کے لئے محسوسات اور جذبات کے بھرپور اظہار کا پس منظر پیش نظر میں لانے کے لئے بے حد ممد ثابت ہوسکتے تھے۔ نازکی صاحب نے ان تغیرات کو محسوس کیا اور انہوں نے اپنی کشمیری شاعری میں اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کشمیری زبان کو قطعات اور رباعیات کی شکل میں ایک بیش بہا سرمائے سے مالا مال کیا۔

نازکی صاحب اگرچہ عملی طور پر کشمیر کی ترقی پسند ادبی تحریک میں کبھی شامل نہیں ہوئے لیکن ان کی رباعیات میں اس خاص مکتب فکر کی ساری حسیت پوری طرح سے جلوہ گر ہے۔ وہ ایک نہایت ہی حساس سخن گو تھے اور اپنے ماحول میں پیدا شدہ یا پیدا کردہ کوائف کا گہرا مطالعہ کر کے انہوں نے ہر جذبات خیز عمل کے ردعمل کو اپنے فن کا جامہ پہنا کر کئی ترقی پسند شاعروں پر سبقت لے لی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی یہ رباعیات ترقی پسند شاعری کی بہترین مثالوں میں ایک اعلیٰ وارفع جگہ پانے کی مستحق قرار دی جاسکتی ہیں:

مَرُن چُھنہ موت ۔ اَدہ ؟ نُو زندگانی
سبٹھاہ رِژ زندگانی جاودانی

پڑس وسواس بلی ہَے ہے مرُن چھُم

بڈس پزہِ جل مرُن ۔ بتھِ چھس جوانی

(مرنا کوئی موت کا آنا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی نئی زندگی کی بشارت ہے جو نیک ہے اور جاودانی ہے۔ پیر مرد خوف زدہ ہے کہ اسے مرنا ہے۔ اسے تو فوراً مر جانا چاہیے کیونکہ اس کے سامنے جوانی اس کا انتظار کر رہی ہے۔)

پکھن واشاہ کڈتھ وچھ ہاتماشاہ

گرشھان چھُم دم یوان چھُم جیرہ وِیئے

سرن ، مرگن ، گرن، بالن تہ آرن

چھہ اندی اندی گیرہ کتھ کنی نیرہ وِیئے

(اپنے پر پھیلا کر میں تماشائے دہر دیکھنا چاہتا ہوں مگر میرا دم گھٹ رہا ہے اور میں تنگ آچکا ہوں کیونکہ میرے یہاں جھیلوں ، مرغزاروں ، گھروں، کوہساروں اور ندی نالوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔ میں باہر آؤں تو کیسے آؤں؟)

خداین چھُے ژیہ استعداد دیتمت

مہ کر برباد شھہ فائتر کتھن منز

غنیمت زان یمِ دوہ زین کینژھاہ

پنُن تقدیر تھو پننین اَتھن منز

(خدا تعالیٰ نے تمہیں استعداد بخشی ہے۔ فضول کی باتوں میں اپنا وقت برباد مت کر۔ یہ چند روز غنیمت جان اور کچھ تو حاصل کر۔ اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لے۔)

وَنداہ، شیناہ ، سماوارا ، حماماہ

کونگاہ ،ہری ساہ تہ توت نُنہ چایہ داماہ

علی شیخاہ ،حسن صوفیاہ ، شمیماہ

رسول میرٕن تہٕ مہجوٗرن کلا ماہ

(زمستان کے دن ہوں، برف ہو، سماوار ہو اور ایک حمام ہو، زعفران ملا ہوا ہریسا کھانے کو اور گرم گرم نمکین چائے کی پیالی پینے کے لئے۔ علی محمد شیخ، غلام حسن صوفی اور شمیمہ دیو کا سنگیت اور رسول میر اور مہجور کا کلام ہو۔)

ترقی کرٕ ، ترقی رٕوز جاری

عوامس کیاہ گوٗمت تم کیا زہ نالان

وٕنن ڈٕو ون کرِتھ موکلے یہ راتھی

چھِ از کل اسٕ وں بوٗنبن مُول گالان

(ہم نے ترقی کی اور اس کی رفتار جاری رہی۔ معلوم نہیں کہ عوام پھر بھی نالاں کیوں ہیں۔ ہم نے تو جنگلوں کا پہلے ہی صفایا کر کے رکھ دیا اور آج کل ہم چناروں کی جڑیں تک کھوکھلی کرنے کے ترقی پذیر کام میں لگے ہیں۔)

ایک ترقی پسند شاعر قنوطیت یا رجائیت کے پیمانے سے اپنے خیال کو ماپ کر اسے بنے بنائے سانچوں میں نہیں ڈھال سکتا۔ ترقی پسندی زندگی کی صحیح اور حقیقی عکاسی ہے جس میں بعض اوقات دنیاوی حالات کا نوحہ یا زندگی سنوارنے کے لئے ایک ایسے عزم کو فوقیت حاصل ہوتی ہے جس کے اظہار میں شاعر کو قنوطی لہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

ہمارے ترقی پسند شاعروں نے گزشتہ نصف صدی میں جو کچھ لکھا اس میں زندگی کے تلخ حقائق، معاشرے کی بدحالی اور تنزل، انسانی اقدار کی پامالی اور زندہ رہنے کی تگ و دو میں بے حساب مصائب اور آلام کا رونا دھونا بھی شامل ہے جسے کسی بھی صورت میں حقیقت سے مفر یا نا اُمیدی کی لہروں میں بہہ جانا نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ شاعری کشمیری زبان کے ہم عصر ادب کا سرمایۂ افتخار کہلایا جا سکتا ہے۔

''نمرود نامہ'' میں مندرج رباعیات کو شاعر نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جو انہوں

نے بالترتیب ان شاعرانہ عنوانات کے تحت اس مجموعہ میں شامل کی ہیں۔(1) داغِ جبین، حُبِ دنیا اور سوزِ دل (2)۔عشق مدینہ، سینے کا جشن نوروز اور (3)۔احوال نامہ اور حکایاتِ دوستان۔

اوّلین حصے میں عشق، شور و مستی، دنیا کی بے ثباتی اور ایسے ہی دیگر متعلقہ موضوعات کو نازکی صاحب نے رباعی کے آئینہ خانے میں سجا کر اسے گوناگوں رنگوں سے آراستہ کیا ہے۔

چونکہ یہ مضمون عام طور پر اُردو دان طبقے کے لئے قلم بند کیا جا رہا ہے لہٰذا ہم نے یہاں پر ان کی منتخبہ رباعیات اُردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش میں اسے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے جس میں غالباً خامیاں بھی رہ گئی ہوں لیکن اس حقیقت کے مدنظر کہ ترجمہ اور خاص طور شاعری کا ترجمہ ناممکن ہے۔امید ہے کہ اس ترجمے کی بدولت ہر ایک کو نازکی صاحب کے خیالات اور احساسات اور ان کی عکاسی کے بارے میں کم از کم واقفیت تو ضرور حاصل ہوگی۔ مقامی تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے رباعیات کا اصل متن بھی درج کیا جاتا ہے۔

نازکی صاحب کی رباعیات کا انتخاب اس لئے اور بھی مشکل بن جاتا ہے کہ ان کی تقریباً ہر رباعی میں ایک پختہ مشق اور ماہر فن استاد کے قلم کی نوائے سروش سنائی دیتی ہے لیکن مقالے کے غیر ضروری طور پر طویل ہونے کے خدشات نے اس انتخاب کو مختصر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ہمارے خیال میں ان رباعیات کی تشریح و توضیح غیر ضروری ہے کیونکہ اس سے یہ گمان غالب ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والے اس وضاحت کے طلبگار ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب اصل اور ترجمہ ساتھ ساتھ ہوں:

غمن منز گیر اوُسُس یاد پیوٚہم
پھیکو پیٹھ بورزن ترووُم کوٚڈُم واش
ژُٹھ زن درایہ اوبرس نارہ وُزمل
کنُھس زن ژاو برژرک نبو اندری گاش

(غموں نے مجھے گھیر رکھا تھا کہ تم یاد آ گئے گویا کندھوں سے بوجھ اُتار کر میں نے دم سنبھالا۔ گویا کڑکتی بجلی بادلوں کا سینہ چاک کر کے باہر آ گئی اور گویا کمرے میں دروازوں کی دراڑوں سے روشنی اندر آ گئی)۔

جدائی ہندی شبن روٹ طول پکِھنا
غمو دتی ہم دِلس منزل مُول پکِھنا
ژلیم گٹہ زوٗل غمکۍ چشمن ییم گاش
اُچھر والو چھہ کوٗرمُت زُول پکِھنا

(شب ہجراں نے طول پکڑا ہے، اب تو آ۔ غموں نے دل میں جڑیں پکڑ لی ہیں، اب تو آ جا۔ اگر تم آوٗ گے تو حزن کا اندھیرا چھٹ کر میری آنکھوں میں روشنی آ جائے گی۔ میری پلکوں نے آنسوؤں کا چراغاں کیا ہے۔ اب تو آ جا)

بے ثباتیٔ دنیا اور موت کی اٹلِ حقیقت کو شاعر نے اس غم ناک لہجے میں بیان کیا ہے:

کتھاہ صبحس وٗنی صبحکی ستارن
روپس چانٛس ہلم عالم چھہ وارن
مگریس چانہِ ییہ موتن قبر کھنٛز
سُہ کیاہ منگہِ دولتس ہارن تہ دیارن

(ستارۂ صبح نے صبح سے ہم کلام ہو کر کہا کہ تمہاری چاندی جیسی روشنی کو دنیا اپنے دامن میں بھر لیتی ہے۔ لیکن جو تمہاری آمد سے اس دنیا ہی سے اُٹھ گیا اس کیلئے دولت اور امارت کس کام کی؟)

نازکی صاحب بقولِ خود علامہ اقبالؔ سے بھی بے حد متاثر تھے اور ہمیں ان کی رباعیات میں کہیں کہیں شاعر مشرق کے فن کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے:

شُبکۍ گٹہ کار دِیتھُم زُول کوٗرمس
اُہم بے کار گترٕ اہ پیالہ گوٗرمس

کرٔہم چانٛسِ زمینس مالہ پوشن
ستن طرفن وتن الماس جوزٕمس

یہ رُباعی اقبال کے اس مختصر فن پارہ کے توارد سے ہی موزون ہوئی ہے:

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار وراغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس نوع کے تقابلی مطالعہ کی غرض یہاں پر کلام اقبال کے ساتھ ناز کی صاحب کی ان چندرباعیات کو بھی درج کیا جاسکتا ہے جن میں اثر پذیری کا یہ محسوساتی عمل نظر آتا ہے لیکن فی الحال اسی ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے:

کران چھکَ تی یہ پانس خوش کران چھے
ستم گر چھکھ دوہے اوسُے نہ بوزُن
مرُن اوس سہل پانس تام ما چھُم؟
بہ مجبوری پوان چھُم زندہ روزُن

(نازکی)

خداوندا تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

(اقبال)

اسی طرح نازکی صاحب نے اپنے کلام میں عمر خیام کو جس طرح سے واضح طور پر اپنے فکر کے سانچے میں ڈھالا ہے وہ ان کی رباعیات میں اقبال سے بھی زیادہ نمایاں ہے:

ستارو زُونہ وون وچھ سائٔی محفل
ژیہٕ کیاہ گوے کیا زہ چھک روزتھ ژہ تنہا
ووشاہ تراوتھ کرن نظر اہ تہٕ وو ننکھ
گوژھُم اکھ محر ماہ لیس راز وَنہ ہا

(نازکیؔ)

اسرارِجہاں چناں کہ در دفتر ماست
گفتن نتوان زانکہ وبالِ سرِ ماست
چوں نیست دریٔں مردمِ ناداں اہلے
گفتن نتواں ہر آنچہ درخاطرِ ماست

(خیامؔ)

یہ کتھ سرہ کرنہ باپتھ چھس کران پاپ
گناہ چھا میانی غالب کنہِ کرم چون ؟

(نازکیؔ)

صد سال بہ امتحان گنہ خواہم کرد
تاجرمِ من است بیش یار رحمت تو ؟

(خیامؔ)

سمبٔھاہ سوچم گُنٔے ووتس نہ ، رووٗس
بہ کتہِ پیٹھِ آس کوٚت گژھہِ کس چُھہ معلوم

(نازکیؔ)

مئے خور کہ ندانی زکجا آمدہٗ
خوشباش ندانی کہ کجا خواہی رفت

(خیامؔ)

پتو لاکن یہ دنیاہ تے امیکُ رنگ
ژھوڑے دھوکاہ فریباہ حسر تھاہ بس
اما تتہ کیا سنا حالات آسن؟
یِوان چھُنہ تورہ کانھ پھیرتھ بہ پرژھہ ہس

(نازکی)

افسوس کہ سرمایہ زکف بیروں شد
وزدستِ اجل بسے جگر ہا خوں شد
کس نامدازاں جہاں کہ تا پرستم ازو
کاحوالِ مسافرانِ عالم چوں شد؟

(خیام)

اگرحاصل کرن چھے کینھ تہِ کرأزی
پگاہ مو کلکھ تہ سوُرے سازو سامان
جوانی ، زندگی، شہرت تہ فرصت
یہ سوُرے سپدہِ خاکس سیتی یکسان

(نازکی)

از دفتر عمر پاک مے باید شد
وز دستِ اجل ہلاک مے بایدشد
اے ساقی مہ لقاتو خوش خوش مارا
آبے در دہ کہ خاک مے باید شد

(خیام)

دوہابنہ فان گژھ یتھ کارخانس
زمین پھٹہِ سم سوتُر گژھہِ آسمانس

سمندر مند نہ ین ٹھولہ ٹھول کرن بال
دِنن گژھِ ترِٛژھ زنٛٹھ اَژِہ لامکانس

(نازکی)

روزے کہ شود اذ السماء انشقت
واں دم کہ بود اذا النّجوم انکدرت
من دامن تو بگیرم اندر عرصات
گوئم صنما بایّ ذنبٍ قتلت؟

(خیامؔ)

''آوازِ دوست'' نازکی صاحب کا دوسرا مجموعۂ رباعیات ہے جو 1985ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے دیباچے میں شاعر اپنی رباعی گوئی کے بارے میں کہتا ہے ''میں رباعی ارادتاً نہیں لکھتا ہوں۔ ایک جذبہ اُبھرتا ہے۔ ایک خیال جنم لیتا ہے، چوتھا مصرعہ موزون ہو جاتا ہے اور اس کے پہلے تین اور مصرعے جوڑے جاتے ہیں''۔ (4)

اس مجموعہ میں نازکی صاحب نے ملا محمد توفیق کشمیری کی اس فارسی رباعی کا ترجمہ بھی شامل کیا ہے۔ اصل رباعی یہ ہے:

بروز حشر آلہا چونامۂ عملم
کنند باز کہ آں روز داد خواہ من است
بکن مقابلۂ او بہ سر نوشت ازل
اگر زیادہ کمی ہست آں گناہِ من است

اور نازکی صاحب کا ترجمہ یوں ہے:

ازل نامس تہ بیہٕ اعمال نامس
مقابلہ کرٕی زہ تی چھُم مدعا بس
اگر تتھ منز کمی بیشی ژیہ باسی

تہِ لکھ عأشاہ کرتھِ میأنس حسابس

نازکی صاحب نے اپنے آس پاس رونما ہونے والے ہر ایسے واقعہ سے تاثر قبول کیا ہے جس نے ان کے ضمیر، فکر اور ادراک کو جھنجھوڑا ہو۔ ہمعصر زمانے کے تکلیف دہ کوائف اور اعمال کو انہوں نے اس رباعی میں قلم بند کیا ہے:

چُھ بأیس بوے یارس یار زاگان
مریدس پیر پیرس دیار زاگان
عوامس منتخب سرکار زاگان
اکس دأنس زہ ہتھ بیمار زاگان

(بھائی بھائی کی تاک میں لگا ہے اور دوست دوست کے پیچھے پڑا ہے۔ پیر اپنے مرید کی ٹوہ میں ہے اور پیر کے پیچھے اس کا مال لگا ہوا ہے۔ منتخب حکومت عوام کے خلاف سرگرم عمل ہے اور یہ ایک انار اور صد بیمار والی بات ہے۔)

نیم خواندہ، مُلاؤں اور ابلہ پیروں فقیروں کے کالے کرتوت اس رباعی میں فاش کئے گئے ہیں:

وُچھتِ صاحب دلن سپدان چُھہ افسوس
ملن ہُند لُوٹھ پیرن ہُند تھپکی ہوس
دلن ہندی خانقاہ وآران پیٹھتی
مشیدن سنگِ مرمر جار فانوس

(اہل دل یہ دیکھ دیکھ کر غمگین ہیں کہ ملاؤں نے لوٹ مچا رکھی ہے اور پیروں نے ہر شئے پر جھپٹنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ افسوس کہ دلوں کی خانقاہیں ویران ہیں اور مسجدوں کو سنگ مرمر اور فانوسوں اور جھالروں سے سجایا جاتا ہے)

ہم عصر دورِ ناہنجار کے ان تکلیف دہ حالات و واقعات کی مایوسی کے عالم سے نکل کر جب نازکی صاحب اپنے کشمیر کی حسین تصویر کو نظروں کے سامنے لاتے ہیں تو ان کا سر فخر

سے بلند ہو جاتا ہے اور وہ مقامی سخن گو شخصیات کو فارسی دنیا کے سرکردہ شاعروں کے مقابلے میں ایک بلند مقام بخشنے میں خوشی اور مسرت محسوس کرتے ہیں :

وطن میونئے جہانس منز چھہ نامی
چھِہ یئتی کی میرؔ تے محمودؔ گامی
چھہ اَکی سیی نادمسؔ منزٕ جمع گامئتی
عراقی ، انوری ، جامیؔ ، نظامی

(میرا وطن ساری دنیا میں نامور ہے۔اس سرزمین نے رسولؔ میر اور محمود گامی کو جنم دیا ہے اور میرے اسی کشمیر کا ایک عبدالاحدؔ نادم، عراقیؔ، انوریؔ، جامیؔ اور نظامیؔ کے ہم پلہ ہے)

ایک دو مقامات پر نازکی صاحب کے خیال میں تکرار موجود ہے جو قاری کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ غالباً انہیں یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ جس مضمون کی رباعی وہ موزون کر رہے ہیں اسی موضوع کو انہوں نے پہلے بھی کسی اور وقت قلم بند کیا ہے۔ مثلاً:

جوانی ، مال وزر ، اولاد واہ واہ
لُکن ہُند یُن گرُھن ، ناماوری ، جاہ
پھُٹم سأری پوتلی الحمد للہ
بصدق دل پوُرم آمنت باللہ

(آوازِ دوست: ص12)

تعلق ، مال ودولت ، حشمت وزر
زن وفرزند ، خیراندیش ، بدخواہ
زضرب لاالہ اِلہ پو تلبن ژہ کرژین
دلس تلقین کر آمنت باللہ

(آوازدوست، ص12)

اسی طرح اُن کے ایک اور مجموعہ ''کووں کی برات'' میں بھی یہ تکرار نظر آتی ہے:

پزر گوو پی زہ دشمن چھے نہ دشمن
تسندِہ شرہ چھے پِوان اکثر خدایاد
کران چھک دوستن سیتیٔ یار باشی!
گژھان چھے غفلتس منزوقت برباد

(کووٗں کی برات، ص:49)

کفیلا ہ چھم نہ کانھ جز حق تعالیٰ
وسیلا چھم نہ جزیاسین والصّاد
خدایا میون دشمن زندہ تھاوُن
تسندہ شرہ چھُم پِوان اکثر خدا یاد

''آوازِ دوست'' میں ایک رباعی کا مصرعہ اوّلین وزن سے گرا ہوا ہے۔ نازکی صاحب جیسے ماہر عروض وعلوم کے بارے میں ہرگز یہ خیال ذہن میں نہیں آسکتا ہے کہ وہ بحر ووزن کے سلسلے میں کسی بھی غفلت کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مصرعہ رواروی میں کاتب نے نقل کیا ہے لیکن اس تصنیف کے مرتب کو اس کا خیال رکھنا چاہئے تھا، مصرعہ یوں ہے:

دپان مخدوٗم صائبن ووٗن میٖرزہ صائبس

یہ مصرعہ اس شکل میں موزون کہلایا جاسکتا ہے:

یہ دوٗن مخدوم صائبن میرزہ صائبس

''کاوِنہ دول'' یعنی کووٗں کی بارات (1996ء) میر غلام رسول نازکی کا آخری مجموعہ رباعیات ہے جس کے پیش لفظ میں انہوں نے خود یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ''اندازہ یہی ہے کہ یہ مجموعہ کلام میرا آخری مجموعہ ہوگا۔ اگر چہ اس بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں مگر ظاہری حالات کی بناء پر اندازہ یہی ہے کہ غالباً مجھے اب اتنی مہلت نصیب نہ ہوسکے کہ میں

اور کچھ لکھ سکوں''۔(5)

''کوؤں کی برأت'' کے نفس مضمون کے بارے میں شاعر اس کی نشان دہی مختصراً یوں کرتا ہے۔''اس کتاب میں زیادہ تر دُنیا کی بے ثباتی اور فکر آخرت کے مضامین غالب ہیں۔ ہمارے پرانے صوفی شعراء نے اس دنیا کو ایک سسرال سے اور دوسری دنیا یعنی آخرت کو میکے سے تعبیر کیا ہے۔ مولوی روم رحمتہ اللہ علیہ نے اسے نَے کا نام دیا ہے جسے نیستان سے کاٹ کر یہاں لایا گیا اور جس کا دل بے قرار ہے کہ میں واپس اپنے نیستان میں جاؤں جہاں سے مجھے جدا کر کے یہاں پہنچایا گیا۔ میں گرفتارِ عذاب ہوں اور مجھے گونا گون آفتوں نے گھیرا ہے''۔(6)

نازکی کا دل عشق محمدیؐ سے ہمیشہ سرشار رہا ہے جس کا اظہار وہ ہر موقعہ کی مناسبت سے نظم و نثر دونوں میں کرتے ہیں۔اس عشق جاودانی کا دلنشین عکس اور تصویر دلکش ہمیں ان کی اُن رباعیات میں جلوہ صدر رنگ لے کے نظر آتی ہے جو ان کی نعتیہ رباعیات میں ہیں اور جو غالباً شدتِ تاثر، اشتیاقِ عقیدت اور جذبۂ محبت میں عبدالاحد نادمؔ کے بغیر اور کسی شاعر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی ہیں۔اس مضمون کی تکمیل ادھوری رہے گی اگر اس میں نازکی صاحب کی ایسی ہی چند رباعیات کو تبرکاً شامل نہ کیا جائے:

سحر وقتن پھُلے لجمژ چھ گوشن
چھ سنگر نالہ طوؔر کی پأٹھی روشن
دلن منز یا محمدؐ پوشہ ٹور بن
زوان پٹھ یارسول اللہؐ چھُ پوشن

(وقت سحر ہے اور ہر گوشے میں پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں کوہِ طور کی طرح روشن ہیں۔اسی عالم میں کلیوں کے دلوں میں یا محمدؐ اور گلوں کی زبان پر یارسول اللہؐ کا ورد ہے۔)

محمدؐ بے کسن ہُند کس محمدؐ
دلکُ آرام روحکُ رس محمدؐ
نجاتچ چھے کنی وتھ رٹھ یہے وتھ
محمدؐ بس محمدؐ بس محمدؐ

(بے کسوں کی دستگیری کرنے والا محمدؐ ہے۔ محمدؐ آرامِ جاں اور روح کا سرور ہے۔ نجات کا بس یہی ایک راستہ ہے اور تو بھی اسی پر گامزن ہو جا اور وہ راستہ ہے محمدؐ، محمدؐ اور بس محمدؐ۔)

بہٕ سُنٛزِ پوشن ژیہٕ کرہ ہے مالہ یکھنا
بہٕ برہ ہے لولہ مسہ کی پیالہ یکھنا
أچھن ہُند گاش وَندہ ہے لالہ یکھنا
مدینکہ ٹاٹھِہ ساتھاہ سالہ یکھنا

(میں تمہارے لئے پھولوں کے ہار بُنوں ۔ میں تمہارے لئے شرابِ معرفت کے پیالے بھر کے رکھوں۔ میرے معشوق میری آنکھوں کی روشنی تم پر قربان۔ اے محبوب مدینہؐ، میری دعوت پر میرے ہاں پل بھر کے لئے تو آ۔)

نظر کرتھم تہٕ زن پیوو تاپھ شینس
کلُبن نوی ہرتہٕ نوٗی کلی کھتی زمینس
اکی پروہ آم زن دون عالمن سونتھ
بہٕ وندہ ہے دین ودنیاہ اتھ جبینس

(تم نے مجھ پر نظر ڈالی گویا برف پر دھوپ پھیل گئی۔ شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں اور زمین سے درخت اُگنے لگے۔ تمہارے ایک ہی جلوے نے میرے دین ودنیا کو بہار سے ہمکنار کر دیا۔ میں اپنا سب کچھ تمہاری جبین پر وار کے یہاں اور وہاں بھی سرشار ہو جاؤں۔)

نازکی صاحب کی رباعیات میں جو دیگر اکابرین سخن کے اثرات کہیں کہیں ملتے ہیں اس کے باوجود وہ اپنے انفرادی اسلوب اور ترسیل تجربہ کو قائم رکھتے ہوئے اپنے کمالِ فن کا مسلسل مظاہرہ کرتے ہیں۔انھوں نے اور بھی کئی اساتذہ اور صحائف سے اثر پذیری قبول کرنے کا خود اعتراف کرلیا ہے جن میں سرفہرست کلام اللہ اور حدیث پاک ہیں اور ان کے علاوہ اس حوالے سے مولانا رومی، بیدل، فیضی، مرزا غالب، سعدی، ابن یمین، نظامی اور غنی کشمیری کے ساتھ ساتھ مولانا حالیؔ اور داغ دہلویؔ کا اثر بھی جہاں جہاں نازکیؔ صاحب کی رباعیات میں موجود ہیں۔انہوں نے اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کیا ہے۔

میر غلام رسول نازکیؔ بھی ایک ایسے عاشق تھے جس کی عام فہم زبان میں کوئی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ یہ عشق عشقِ خدا بھی تھا۔اس میں عقیدتِ رسول بھی غالب تھی اور اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مادرِ وطن کشمیر، اپنی زندگی اور اس کی رعنائیوں اور جلوہ سامانیوں سے بھی محبت کی ہے۔اگر چہ وہ دُنیا کو ''وانگج دور''یعنی کرایہ کا گھر ہی سمجھتے رہے۔

یہ عشق نازکی صاحب جیسے استاد شاعر کے دل پر کاری ضربیں بھی لگاتا ہے اور زمستان کی کڑاکے کی سردی میں چنار کے پتوں سے تپتی ہوئی آگ کی حدت اور حرارت بھی بخشتا ہے۔



حوالہ جات

(1)- خیام۔سید سلیمان ندوی۔دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی،اعظم گڈھ،یوپی،ص228-227۔

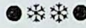
(2)- نمرودنامہ؛کوہ نور پرنٹنگ پریس سرینگر،1964،ص7۔

(3)- ایضاً ص8۔

(4)- آوازِ دوست،فوٹو ورکس دہلی،1985،ص3۔

(5)- کاوہِ ینہِ وول،تابش پبلی کیشنز سرینگر،1996ء،ص8-7۔

(6)- ایضاً ص8۔



نازکی اور چند یادیں

میں 1954ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر میں نیوز ریڈر اور اناؤنسر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ اُن دنوں یہ نشریاتی ادارہ وادیٔ کشمیر میں ادب، فن اور ثقافت کا ایک قابل توجہ گہوارہ بن چکا تھا جہاں ریاست اور بیرونِ ریاست کے چیدہ چیدہ ادیب، شاعر اور دانشور مختلف عہدوں پر اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کی بھی آبیاری کر رہے تھے۔ ان میں میر غلام رسول نازکی، عبدالحق برق، علی محمد لون، سہیل عظیم آبادی، شفیع شفائی، پران کشور، پشکر بھان، وی ایس این کیمفر، کنول نین پرواز، غلام حسن اعجاز، بشیر بٹ اور اسی قبیل کے دیگر اہل علم و دانش شامل تھے۔

اُنہی دنوں وزیر اعظم بخشی غلام محمد کی ہدایات پر جشنِ کشمیر کا ایک طویل مگر دلچسپ سلسلہ شروع کیا گیا اور نازکی صاحب کو اس کی ادبی کمیٹی کا سیکریٹری نامزد کیا گیا۔ نازکی صاحب کے ذمہ خاص طور وادی کے طول و عرض میں مشاعروں کا اہتمام کرنا تھا جو ڈوروشاہ آباد سے لے کر سوگام لولاب تک منعقد ہوا کرتے تھے۔

میں نے انہی دنوں دنیائے سخن میں قدم رکھا تھا لیکن نازکی صاحب کی طرف سے جب مجھے بھی مشاعروں میں شرکت کے لئے پے در پے دعوت نامے موصول ہونے لگے تو مجھے بھی متوقع طور پر یہ گمان ہونے لگا کہ ہم بھی سخن گو ہیں۔

اِن مشاعروں میں شعراء کی بھرپور شرکت، لاتعداد لوگوں کی شمولیت اور خاص کر بخشی صاحب کی بذاتِ خود موجودگی ایک ہنگامہ خیز ماحول پیدا کرتی تھی۔ یہ سلسلۂ شعروشاعری کبھی کبھی رات گئے تک جاری رہتا تھا اور بخشی صاحب بعض اوقات اپنی نشست سے اُچھل اُچھل کر شاعروں کو داد دیتے تھے۔ مشاعرے کی شرکت کا اعزازیہ پچیس روپے تھا۔

اُنہی دنوں نازکی صاحب سے ساتھ میری شناسائی کا آغاز ہوا۔

ایک دو بار جب میں چند وجوہات کی بناء پر ان مشاعروں میں شامل نہیں ہوسکا تو نازکی صاحب بظاہر مجھ سے ناراض ہوئے۔ ایک بار وہ ریڈیو کے نیوز روم میں داخل ہو کر ہمارے نیوز ایڈیٹر مرحوم جگن ناتھ ولی سے اس طرح میری شکایت کرنے لگے۔ "دیکھو اس سادہ لوح نوجوان کو، مشاعروں میں آتا ہی نہیں۔ شاید اسے معلوم نہیں کہ پچیس روپے کوئی چھوٹی رقم نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی یہ کہ میں اسے یہاں کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانا چاہتا ہوں کیونکہ اس میں مجھے ایک رمق نظر آتی ہے لیکن اسے دیکھو کہ اپنے ہی نخروں میں اُلجھا ہوا ہے"۔ اس کے بعد میں ہر مشاعرے میں سب سے پہلے پہنچ جاتا تھا اور بعض اوقات تو بن بلائے بھی حاضر رہا اگرچہ نازکی صاحب نے اُن مواقع پر بھی مجھے معاوضہ سے محروم نہیں رکھا۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ جگر مراد آبادی ایک کل ہند اُردو مشاعرے میں شامل ہونے کی غرض سے کشمیر آئے اور نازکی صاحب کو انہوں نے اپنی ایک غزل اپنے مخصوص اور خوبصورت خط میں تحریر کر کے تحفتاً عطا کی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ریڈیو کے ایک کمرے میں جگر صاحب نے تختی اور کاغذ لے کر اس غزل کو قلم بند کرنا شروع کیا تو پروفیسر جیالال کول نے، جو اس وقت ریڈیو میں مشیر برائے کشمیری تھے، احتراماً جگر صاحب کی تختی کو سنبھال کر انہیں سہارا دینے کی کوشش کی لیکن جگر صاحب نے فوراً ہاتھ جھٹک کر وہ تختی نازکی صاحب کے ہاتھ میں تھما دی اور غزل مکمل کر لی جو آج بھی ایک نادر نمونے کی شکل میں خانوادۂ نازکی میں ایک خوبصورت فریم میں محفوظ ہے۔

نازکی صاحب جب مشاعروں میں اپنے منفرد انداز کے ترنم سے اپنا کلام پڑھتے تو وہ اکثر و بیشتر اپنا کشمیری کلام بالخصوص رباعیات سناتے تھے۔ انہوں نے کئی بار میرے سامنے میرے بارے میں یہ اظہارِ تاسف کیا کہ میری آواز ترنم سے خالی ہے اور میں تحت اللفظ ہی پڑھتا ہوں۔ ورنہ بقول اُن کے "ایک خوبصورت چہرے کے ساتھ خوبصورت

ترنم تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے"۔

ریڈیو میں میری ملازمت کے دوران انہوں نے کئی بار مجھ سے میرا کلام سننے کی فرمائش کی اور قدم قدم پر وہ میرے ناپختہ اشعار کی نوک پلک خود ہی درست کر کے کہتے "اب دیکھ تمہارا یہ شعر کیا سے کیا ہوگیا"۔ واقعی پارس پتھر کو چھولے تو سونا بن جاتا ہے۔

اُن کی اسی خیال نوازی کے پیش نظر میں نے اشاعت سے پہلے اپنا عمر خیام کا کشمیری ترجمہ انہیں مسودہ کی شکل میں دِکھایا اور انہوں نے کئی ہفتے تک دل لگا کر اس کی اصلاح کی۔ یہ اصلاح دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک استاد کی رہبری ایک نووارد بساطِ ادب کو مجلس ادب میں ایک اعلیٰ مقام پر براجمان کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ بعد میں جب یہ ترجمہ 1963ء میں کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہوا تو انہوں نے اپنے مختصر تبصراتی کلمات میں اس کی فنی پختگی اور زیبائی کا ان الفاظ میں اعتراف کیا۔ "یہ بات واقعی قابل تحسین ہے کہ عمر خیام کی رباعیات کا یہ کشمیری ترجمہ پڑھنے کے بعد قاری ایک قسم کی تشفی محسوس کرتا ہے تشنگی نہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ یہ ترجمہ کشمیری ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کہیں کہیں ایسا گمان ہوتا ہے کہ خیالؔ نے حسن بیان، شعر کی لطافت اور استعاروں کے لطیف استعمال میں عمر خیامؔ پر بھی سبقت حاصل کر لی ہے"۔

یہ اللہ کا کرم اور مرحوم و مغفور کی عنایت ہے کہ انہیں مجھ سے بے حد شفقت تھی۔ جب بھی ہم ریڈیو میں یا کلچرل اکادمی میں ملاقی ہوتے تو وہ پہروں تک میرے ساتھ ادب اور دیگر غیر ادبی موضوعات پر اطمینان سے باتیں کرتے رہتے اور اس گفتگو کے دوران میں ان کے بے مثال حافظہ کی ودیعت سے مبہوت ہو کے رہ جاتا جو خدا شاذ و نادر ہی اپنے کسی بندے کو عطا کرتا ہے۔ انہیں ہمیشہ یہ شکایت رہتی کہ معاشرے میں اور خاص کر ثقافتی دنیا میں عامیانہ پن روز بروز غالب آتا جا رہا ہے۔ تعلیمی طور پر سند یافتہ لوگ خواندہ تو کہلائے جا سکتے ہیں مگر ان میں سے اکثر و بیشتر علم و دانش کے زیور سے آراستہ نہیں ہیں۔ اس دوران وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے اور غالباً ہر عذاب و احساس کو دھوئیں میں اُڑاتے۔

نازکی صاحب کی وفات کے پورے ایک سال بعد یعنی 16 اپریل 1999ء کو ریڈیو کشمیر سرینگر کے آڈیٹوریم میں مرحوم کے لئے ایک یادگار تقریب ہوئی جس میں کئی ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور پروفیسر سیف الدین سوزؔ بھی موجود تھے۔ اس تقریب پر میں مرحوم کے ایک فرزند ڈاکٹر ایاز رسول کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے مجھے اپنے والد کا ایک واقعہ سنایا جس سے میں نازکی صاحب کی طرف سے آنے والے فون سے پہلے ہی آگاہ تھا لیکن فون کے پس پردہ دولت کدۂ نازکی میں ہونے والی باتیں ایاز رسولؔ نے اس طرح دہرائیں۔ ''مارچ 1998ء کی ایک شام تھی۔ والد محترم نازکی صاحب صاحبِ فراش تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے ناتوانی کے باعث دوسروں کے ساتھ ٹیلی فون پر بھی بات کرنے کا سلسلہ ختم کیا تھا۔

''اس وقت وہ آپ کی کتاب ''اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر'' کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ میں اور ماموں نعیم اختر اُن کے پاس خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔''

''اچانک انہوں نے نعیم سے کہا، خیالؔ صاحب سے ٹیلی فون پر بات کراؤ۔ جب فون پر رابطہ ہوا تو نازکی صاحب نے خیالؔ صاحب کو ایسی شاندار کتاب لکھنے پر بے تحاشہ مبارکباد دی۔ نازکی صاحب کی طرف سے کسی دوست کے ساتھ فون پر بات کرنے کا یہ عمل ایک عرصے کے بعد ظہور پذیر ہوا تھا اور یہی ان کی زندگی کی آخری فون کال تھی۔''

''جیسا کہ ہم ان دونوں کی گفتگو سے اخذ کر سکے آپ شاید غالباً نازکی صاحب کی تعریف و تحسین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے کہہ رہے تھے کہ وہ تبرکاً اس کتاب کے بارے میں تحریری طور پر اپنے خیالات عنایت کریں۔ نازکی صاحب نے جواباً آپ سے کہا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ''واللہ میں بات بھی ٹھیک سے نہیں کر پاتا۔ یہ اس کتاب کے مطالعہ کا معجزہ ہے کہ مجھ میں ایک نئی قوتِ گویائی پیدا ہوئی اور آپ سے بات کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو ضرور لکھوں گا لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اُس سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا''۔

''آپ کے ساتھ فون پر اُن کی باتیں کچھ لمحوں تک ہوتی رہیں۔ پھر نازؔکی صاحب ہم سے کہنے لگے کہ ایک عرصے کے بعد ایک بہت ہی اچھی کتاب پڑھنے کا موقعہ نصیب ہوا ہے۔ خیاؔل صاحب نے اس موضوع کے ساتھ نہایت دیانتداری سے پورا انصاف کیا ہے اور ایک بیش بہا اور قابل قدر تصنیف ہم تک پہنچائی ہے۔'' پھر کہنے لگے ''اس کتاب کو پڑھو اور بار بار پڑھو اور سیکھ لو کہ کتاب کس طرح اور کیسی خوبصورت اُردو میں لکھی جاتی ہے''۔

''نازکی صاحب اس کے صرف ایک ماہ بعد 16/اپریل کو انتقال کر گئے''۔

میں ان چند سدا بہار یادوں کو میر غلام رسول نازؔکی کے لئے اپنے تحریر کردہ اس مختصر منظوم خراجِ عقیدت کے ساتھ اختتام تک لاتا ہوں :

نزاکت شاعری کی نازؔکی ہے
جو کچھ اس نے کہا حرفِ خودی ہے
قلم اُس کا جو تھا آوازِ دل تھا
سخن اُس کا پیامِ زندگی ہے



غلام رسول سنتوش.......
میرا مخلص دوست

گزشتہ صدی کے پانچویں اور چھٹی دہائی کے دن تھے۔ سرینگر میں کلچرل کانفرنس کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بازار گرم تھا۔ کانفرنس کی ہفت روزہ نشستوں میں درجنوں شاعر، ادیب، نقاد، مصور، فن کار اور دیگر کلاکار ذوق وشوق سے حصہ لے کر یہاں کی ادبی زندگی میں ایک نئی حرارت پیدا کر رہے تھے۔

اسی دوران ایک دن ایک پستہ قد، بھرے بھرے چہرے والا اور بالوں کو کھچڑی بنائے ایک شخص اس محفل میں وارد ہوا اور خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ کر نشست کی کارروائی کو خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ ذہن نشین کرتا رہا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام غلام رسول ڈار ہے اور وہ سرینگر کے ایک وسطی محلّہ چنکرال محلّہ کا رہنے والا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ دسویں پاس ہے لیکن سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہنے کے بعد دکانوں کے سائن بورڈ لکھتا ہے اور بوقتِ ضرورت ریشم کی بُنائی بھی کرتا ہے اور پیپر ماشی کا کام بھی کرتا ہے۔ چند دنوں کے بعد اُس کا نام غلام رسول سنتوشؔ پڑ گیا۔

سنتوشؔ کی یہ سب سے بڑی خاصیت تھی کہ اس نے پیٹ کا دوزخ بجھانے کی خاطر جو کام بغیر کسی ہچکچاہٹ اور خوف کے اپنائے دوسرا کوئی بھی شخص غالباً انہیں اپنے لئے ہتک آمیز تصور کر لیتا لیکن سنتوشؔ اپنی لگن اور محویت کے ساتھ یہ کام نہایت فن کاری کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ اس نے کئی سال تک دیواروں پر سفیدی کرنے کے کام میں بھی کوئی مضائقہ نہیں پایا۔

رفتہ رفتہ جب کانفرنس کی ہفت روزہ مجلسوں میں غلام رسول سنتوشؔ کے گُن

ظاہر ہونے لگے تو پتہ چلا کہ وہ ایک بہت بڑا مصور بننے کی راہ پر بے خوف وخطر نکل پڑا ہے اور سارے ہندوستان میں اس شعبے میں نام کما کر کشمیر کا نام بھی روشن کرنا چاہتا ہے۔ اپنی خود پسندی اور خود اعتمادی کی بدولت بالآخر اسے یہ شہرت حاصل ہو کے ہی رہی۔

مصوری کے فن میں سنتوش نے اُس وقت کے مشہور فن کار سوم ناتھ بھٹ، دینا ناتھ المست اور تریلوک کول سے اگرچہ فیضان اور رہنمائی بھی حاصل کرلی لیکن بعد میں اس نے کسی اور کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے ہی موقلم کو انفرادی اظہار خیال اور تصور کی عکس بندی کے زیور سے اس طرح آراستہ کیا کہ سنتوش کی تصاویر کو ہزاروں لاکھوں مصوری کے نمونوں میں رکھ کر بھی انہیں آسانی کے ساتھ شناخت کیا جانے لگا۔

1958ء میں ریاست میں کلچرل اکادمی کے قیام کے ساتھ ہی وہ اس ادارے کے ساتھ سرگرمی سے وابستہ ہوگیا جہاں اکادمی کے اوّلین سیکریٹری میرزا کمال الدین شیدا صاحب نے اُس کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اسے کئی اہم کام سونپ دیئے جن میں اکادمی کی طرف سے شائع شدہ کتابوں کے سرورق کی تیاری اور ان کی تزئین کاری بھی شامل تھی۔ سنتوشؔ کے کام کرنے کا ڈھنگ بالکل الگ تھا۔ ہ جس فرضِ منصبی میں جٹ جاتا تو دنیا ومافیہا سے بے خبر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر دم نہیں لیتا۔

سنتوش کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات رفتہ رفتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے تو میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ کینواس کو سامنے رکھ کر گھنٹوں خیالات کی دنیا میں محو ہو جاتا اور اس دوران کھانا پینا بھولنے کے علاوہ وہ اپنے اہل خانہ کی کسی بھی بات کا مشکل سے جواب دیتا۔ جب اُس کا کام جزوی طور پر تک مکمل ہو جاتا کیونکہ ایک Painting کو ایک ہی نشست میں مکمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ تو مجھے ایک موٹی سی گالی دے کر کہتا ''چلو اب کچھ کھالیں اور کشمیری زبان میں ادب کی باتیں کریں''۔

مصوری کے ساتھ دل سے وابستہ رہنے کے ساتھ ساتھ سنتوشؔ نے اپنے یار دوستوں کی صحبت کے زیر اثر کشمیری میں شاعری کرنے کا بھی شغل شروع کیا۔ اسے

دوسروں کو شاعری سنانے اور اس کی داد حاصل کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کا یہ شوق کبھی کبھی احباب کے لئے بوریت کا بھی سبب بن جاتا لیکن سنتوشؔ اپنی بحر طویل سنانے کا سلسلہ طویل ترکرنے سے کبھی باز نہیں آتا۔ سنتوشؔ کی شاعری سننے اور مجبوراً اسے داد دینے کی یہ محدود احباب پر مشتمل محفلیں سرینگر میں ایک خاص جگہ لبؔ کول کے میکدہ میں رات گئے تک جاری رہتیں۔

ایک روز سنتوشؔ سرینگر کے انڈیا کافی ہاؤس میں بین الاقوامی شہرت کے مالک مصور مقبول فداؔ حسین کو ساتھ لے کر اس قہوہ خانے میں لایا۔ باتوں باتوں میں میں نے حسینؔ صاحب سے مذاقیہ طور پر پوچھا ''کیا آپ اپنے قلم سے اپنی تصویر بنا سکتے ہیں؟'' حسین صاحب نے فوراً کاغذ کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لے کر اس پر چند آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ لیں اور مجھ سے کہا ''یہ آپ کو پیش کرتا ہوں''۔ میں نے جب اس کاغذ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس عظیم مصور نے ہو بہو اپنی تصویر کا خاکہ انتہائی فن کاری کے ساتھ کھینچا تھا۔ یہ نادر نمونہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

غلام رسول سنتوشؔ کی زندگی میں ایک ہنگامہ خیز موڑ اُس وقت آ گیا جب اس نے شہر کی ایک پنڈت لڑکی سے شادی کر لی۔ اس پر لڑکی کے گھر والوں اور سنتوشؔ کے رہائشی علاقے کے چند جاہل اور عاقبت نا اندیش پنڈتوں نے ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کیا اور انہوں نے سنتوشؔ کو گرفتار کروانے اور اس شادی کو توڑنے کا احمقانہ مطالبہ کیا۔ ان ہنگامہ پرستوں نے سنتوش کے خلاف لاتعداد تار اور خطوط اکادمی کے سیکریٹری کو بھی ارسال کئے جن میں طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں تھیں۔

اپنے آپ کو نادیدہ خطرات اور ناموافق ماحول کی زوردار آندھی میں گھرا ہوا دیکھ کر سنتوشؔ نے اسی میں اپنی خیریت جان لی کہ وہ اپنی بیوی توشہؔ کو لے کر دلّی بھاگ گیا جہاں اس نے ڈیفنس کالونی میں ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا۔ مصیبت کی اُس نازک گھڑی میں دہلی کے ایک فن شناس اور کمار آرٹ گیلری کے مالک کمار صاحب نے سنتوشؔ کی اتنی

امداد کی کہ کشمیر کے چند جنونی پنڈتوں کے مقابلے میں اس ہندو کمار صاحب کو ایک فرشتہ کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

میں بدستور اکادمی میں ملازمت تھا اور اب وہاں علی جواد زیدی نے اس کے سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا تھا۔ زیدی صاحب نے ایک دن میرے سامنے یہ خواہش ظاہر کی میں حضرت شیخ یعقوب صرفی ایشان صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے فارسی پنج گنج کی تدوین اور ترتیب کا کام سنبھالوں جسے بعد میں اکادمی کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔ پنج گنج کی پانچ مثنویوں میں سے ایک کا قلمی نسخہ رام پور یوپی کی رضا لائبریری میں موجود تھا جس کی نقل تیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا تاکہ پنج گنج کو ایک مکمل صورت دے کر منظر عام پر لایا جائے۔

زیدی صاحب نے سرکاری خرچ پر میرے رام پور جانے کے لئے احکامات جاری کئے اور میں سرینگر سے باہر کسی شہر میں جانے کے لئے پہلی بار کشمیر سے باہر کی دنیا میں قدم رکھنے کے لئے روانہ ہوا۔ دلّی میں میرا قیام سنتوش کے ہاں رہا جس نے مجھے دل و جان سے اپنے فلیٹ میں جگہ دی اور جی جان سے میری خاطر داری کی۔ اس کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا پروستا اور خود ہی کھلاتا۔ اُس دوران اس کی وفاشعار، شریف النفس اور فرمانبردار بیوی توشہ بلائیں لے لے کر مجھے کھانا پوری طرح سے کھانے کے لئے منتیں کرتی اور سنتوش کبھی کبھی مذاق میں اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیتا "کیوں اس چھ فٹ لمبے آدمی کے پیچھے پڑی ہو۔ اگر اس نے تمہاری بات مان لی تو کیا اس کا پیٹ پھٹ نہیں جائے گا"۔

اُن دنوں سنتوش کی قسمت اس کے شعبہ فن میں اس لئے چمک اٹھی تھی کہ اس نے ترکا یا شیو فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کی اپنے موقلم سے عکاسی کرتے ہوئے اپنا بہت سارا وقت صرف کر لیا تھا اور ہندوستان کے چوٹی کے مصوروں کی صفوں میں اپنی خاص جگہ بنالی تھی۔ چونکہ ہم اس فلسفہ اور اس کے برمحل یا مبنی برحقائق کے پس منظر سے واقف نہیں اور نہ

ہی ہم نے یہ واقفیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش کی ہے۔ لہٰذا ہم سنتوشؔ کے اس مکتب مصوری پر کوئی خامہ فرسائی نہیں کریں گے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس خیال کی عکاسی ان کی تصاویر میں ایک خاص قسم کا جادوئی عمل اور اس عمل کے نتیجے میں نہایت ہی سحر انگیز اور دل کو آلہ ثقل کی طرح اپنی طرف کھینچنے والے فن کا کمال نظر آتا ہے جو سنتوشؔ کو ہم عصر کشمیری مصورین میں بلاشبہ سب سے ممتاز اور بلند مقام عطا کرتا ہے۔

سنتوشؔ دہلی میں مقیم تھا کہ اس پر سرینگر میں ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ چند بے رحم بندوق برداروں نے اس کے شریف الطبع اور کم گو بھائی صادقؔ کو قتل کر دیا۔

غلام رسول سنتوشؔ نے اس دوران ادب کی دنیا میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی۔ اس نے اُردو زبان میں ایک ناول "سمندر پیاسا ہے" بھی تخلیق کیا تھا اور اس کے کشمیری مجموعۂ کلام "بے سوکھ روح" کو ساہتیہ اکادمی کے پروقار انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ 1977ء میں اسے پدم شری کا خطاب بھی دیا گیا۔

غلام رسول سنتوشؔ زبردست قوتِ ارادی کا مالک تھا لیکن اس احساس نے بعض اوقات اس کے ہاتھوں ایسے تجربے بھی کروائے جو بہرحال ناکام ہی ثابت ہوئے۔ اس کے اُردو ناول "سمندر پیاسا ہے" کو خاص پذیرائی حاصل نہیں ہوئی کیونکہ جس زمانے میں اس نے یہ ناول تحریر کیا وہ کشمیری زبان کی نشاۃ الثانیہ کا دور تھا جس کی بنیاد 1947ء میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریر پر استوار ہوئی تھی۔ اس تحریک کی بدولت پہلے پہل اُردو زبان میں ادب تخلیق کرنے والے شاعروں اور ادیبوں دینا ناتھ نادم، امین کامل، رحمان راہی نے اس زبان کو خیرباد کہہ کر اپنی مادری زبان میں اپنی فنکارانہ مہارت کا لوہا منوایا تھا اور 1950ء اور 1970ء کا یہی وہ زمانہ تھا جس نے کشمیری شاعری کو عدیم المثال تخلیقات سے مالامال کر دیا تھا۔

"بے سوکھ روح" سنتوشؔ کے کشمیری کلام کا مجموعہ ہے جس میں مندرج شاعری کو اوّل درجے کی سخن گوئی کے زمرے میں شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن یار دوستوں کی خیرخواہی کام

آئی اور اسے اس مجموعۂ شاعری کے لئے ساہتیہ اکادمی کا انعام دیا گیا۔

سنتوش نے صحافت کی دنیا میں ''کاشر ادب'' کے نام سے ایک ثقافتی رسالہ جاری کر کے ایک ناکام تجربہ کیا جس کے مارے یہ جریدہ صرف چند ماہ تک ہی اکھڑی اکھڑی سانسیں لے کر دم توڑ بیٹھا۔

البتہ سنتوش کے نام جس شعبے میں اُس کی مایہ ناز کارکردگی کا سہرا بندھا تھا وہ آخر کار اس میں زبردست بالا دستی حاصل کر کے ہندوستان کا ایک ممتاز مصور بن گیا اور اسی دین کی بدولت اسے للت کلا اکادمی کے اعزاز سے نوازا گیا جس کا وہ ہر طرح سے مستحق تھا۔

سنتوش کی ان قلابازیوں سے قطع نظر سنتوش نے بہر حال ایک شاندار، نرم دل اور شفیق انسان کی طرح اپنی گذاری اور ہر مخالف ہوا کو اپنے مضبوط ہاتھوں سے ہٹا کر اپنے لئے شہرت اور مرتبت کے مطلع سے عوام میں قبولیت کا سورج روشن کیا۔

مالی اعتبار سے سنتوش مشکل سے ایک خود کفیل شخص تھا لیکن جب بھی اُس کے سامنے کسی شناسا کی مشکل آجاتی تھی وہ قدمے، درمے اور سخنے اس کی اعانت کرنے سے کبھی پیچھے نہیں رہتا۔

سنتوش کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگر وہ مسلکی اعتبار سے اہل تشیعہ میں سے تھا لیکن اس نے مذہب کی تمام تنگ نظری پر مبنی جزئیات کو خیر باد کہا تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایک سیکولر اور روشن دماغ اور واضح نظریہ رکھنے والا فنکار تھا۔

البتہ کبھی کبھی اُس کی اس عقیدتی زندگی کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور ہو جانا پڑتا تھا جب یہ دیکھا جاتا کہ وہ عاشورہ کے جلوس میں ایک کٹر شیعہ کی صورت میں شامل ہو کر سینہ کوبی کرتا نظر آتا۔ بہر حال خواہ وہ غلام رسول تھا یا سنتوش تھا، ایک بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اوّل و آخر ایک انسان تھا اور ایسے انسانوں کی آج کل دانشوروں کے طبقے میں کمی ہی نظر آتی ہے۔ اس کمی کے اسباب میں شاید وہ دورِ ہنجار بھی شامل ہے جو سرزمین کشمیر پر 1990ء سے بہت حد تک غالب آچکا ہے۔

میری زندگی کے صحافتی سلسلے میں سنتوش نے قدم قدم پر میری قلمی اور موقلم کی مدد کی۔اس نے میرے کشمیری ہفت روزہ ''وطن'' کے شہید نمبر، عید نمبر اور اُردو اخبار ''اقبال'' کے بنگلہ دیش نمبر کی بھی تزئین کاری کی اور اس میں شامل مضمون نگاروں کے قلمی خاکے بنا کر اِن خصوصی اشاعتوں کو ایک مخصوص زیب وزینت سے آراستہ کیا۔

سنتوشؔ کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات کم وبیش تیس سال پر محیط رہے اور میں اسے آج بھی اپنے سب سے زیادہ قریبی اور غیر رسمی دوستوں میں شامل کرتا ہوں کیونکہ اس میں میں نے کبھی تصنع اور ریاکاری کا شائبہ تک نہیں دیکھا۔

اُس کی خاص عادت یہ تھی کہ وہ اپنے بے حد قریبی احباب کو، جن میں میں بھی شامل تھا، اس انداز سے گالیوں سے نوازتا گویا اُن کی تعریفیں کر رہا ہو۔ یہ سنتوشؔ کا اپنا ایک مخصوص اندازِ گفتگو تھا جس سے یار لوگ مشتعل ہونے کے بجائے محظوظ ہوا کرتے تھے۔

1929ء میں ایک نچلے درجے کے متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والا غلام رسول سنتوشؔ 10 مارچ 1997ء کو اپنی جنم بھومی سے دور دلّی میں انتقال کر گیا جہاں گنتی کے چند احباب اور کشمیری پنڈتوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کی موجودگی میں اسے بہادر شاہ ظفر مارگ پر اخبار ''انڈین ایکسپریس'' کے عقب میں ایک قبرستان میں دفن کیا گیا۔اس کے لوحِ محفوظ میں اپنے وطن مالوف سے دور ہی سفر آخرت پر روانہ ہونا رقم ہو چکا تھا اور اس کا لوحِ مزار آج بھی بزبان حال کہہ رہا ہوگا :

برمزارِ ماغریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے



